الرسالہ

Al-Risāla

November 2004 • No. 336 • Rs. 10

جھوٹ کی اشاعت کرنا جھوٹ میں شریک ہونا ہے، اور سچ کی
اشاعت کرنا سچ میں شریک ہونا۔

تذکیر القرآن

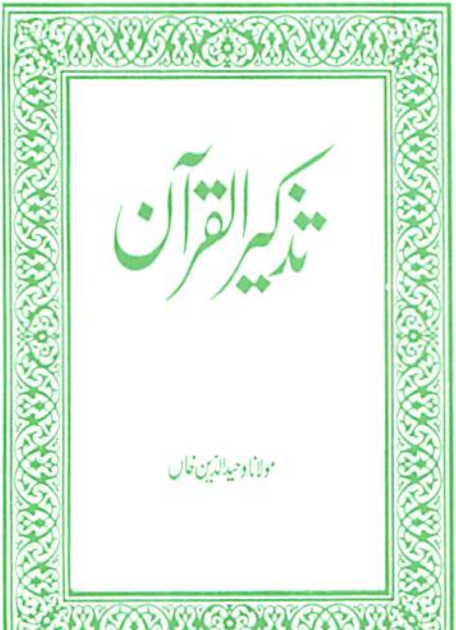

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپئے (ہارڈ باؤنڈ)

۲۵۰ روپئے (پیپر بیک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحیدالدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 5454
Fax: 2435 7333
email: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $20 (Air Mail)

Distributed In England by
IPCI: Islamic Vision
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

Distributed in the USA by
Al-Risala Forum International
2665 Byberry Rd.
Bensalem, PA 19020 (USA)
Tel/fax: 215-639-3584
e-mail:caleem@juno.com

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

نومبر 2004

فہرست

روزہ عجز کی تربیت 2

خدا اور بندہ 3

لاعیش اِلّا عیش الآخرۃ 4

بھلانے کی ضرورت 5

انسان کدھر 6

سفری کلاس (Class on wheels) 7

New Release!

روزہ عجز کی تربیت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ روزہ تمہارے اوپر اس لیے فرض کیا گیا تا کہ تمہارے اندر خدا کا ڈر پیدا ہو (البقرہ ۱۸۳) خدا سے ڈرنا کیا ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اعتراف کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ عجز کا اعتراف ہی ایمان کا آغاز ہے۔ جب کسی آدمی کو خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اُس کے اندر سب سے زیادہ جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ یہی عجز ہے۔ خدا پر ایمان دراصل خدا کی بے پناہ عظمت کو دریافت کرنا ہے۔ اور جو آدمی خدا کی بے پناہ عظمت کو دریافت کرے اس کا حال یہی ہوگا کہ وہ عجز کے احساس میں ڈوب جائے گا۔ اُس کے اندر جو سب سے بڑی صفت پیدا ہوگی وہ یہی عجز کی صفت ہے۔

ایمان خدا کی معرفت کا دوسرا نام ہے۔ اس خدا کی معرفت جو اتھاہ کائنات کا خالق و مالک ہے۔ جو حیرت ناک قدرت کے ساتھ اس اتھاہ کائنات کو کنٹرول کر رہا ہے۔ یہ شعور جس عورت یا مرد کے اندر پیدا ہو جائے اُس کا حال یہی ہوگا کہ اس کو تمام عظمتیں خدا کی طرف دکھائی دیں گی اور اپنی طرف اس کو عجز کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دے گا۔

عجز سادہ طور پر صرف ایک احساس کا نام نہیں ہے۔ عجز کسی انسان کی زندگی میں سب سے بڑی قوت محرکہ ہے۔ عجز آدمی کی پوری شخصیت میں ایک بھونچال پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ عجز آدمی کے ذہن وفکر میں کامل انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔

عجز کے احساس کا تعلق خدا سے ہے۔ مگر جب کسی آدمی کے اندر حقیقی معنوں میں عجز کا احساس پیدا ہو جائے تو انسانی تعلقات میں اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو خدا کے سامنے عاجز بناتا ہے وہ اپنی اسی اسپرٹ کے تحت انسانوں کے سامنے متواضع بن جاتا ہے۔ عجز خدا کی نسبت سے عجز ہے، اور انسان کی نسبت سے تواضع۔

خدا اور بندہ

علی بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ ان کے پاس سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا۔ جب انھوں نے اپنا پاؤں اس کے رکاب میں رکھا تو کہا بسم اللہ۔ پھر جب وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیے تو کہا الحمد للہ، سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ اس کے بعد انھوں نے تین بار اللہ کی حمد کی اور تین بار اللہ کی تکبیر کی۔ پھر کہا: سُبحانکَ لَا الٰہَ اِلّا انتَ قد ظلمتُ نفسی فَاغفِرلی۔

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے امیر المومنین، آپ کس بات پر ہنسے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے سوار ہوتے ہوئے وہی کہا جو میں نے کہا۔ پھر آپ ہنس پڑے۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، آپ کیوں ہنسے۔ آپ نے فرمایا:

یعجب الربُّ تبارك وتعالیٰ من عبدہ اذا قال ربّ اغفرلی۔ ویقول علم عبدی انہ لایغفر الذنوبَ غیری۔ (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۲۴)

بندہ جب کہتا ہے کہ اے میرے رب، مجھے بخش دے تو اللہ تعالیٰ اس پر تعجب کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے اس کو جانا کہ میرے سوا کوئی بھی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

رَبِّ اغفِرلی (میرے رب، مجھے بخش دے) کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ ایک عظیم ترین دریافت کے نتیجہ میں نکلنے والا کلمہ ہے جو ایک مومن کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔

یہ کلمہ کسی کی زبان سے اس وقت نکلتا ہے جب کہ وہ غیب کے پردے کو پھاڑ کر خدا کی موجودگی کو دریافت کرے۔ یہ آزادی کے باوجود اس بات کا اقرار ہے کہ میں اپنی آزادی کو بے قید استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ حشر کو دیکھے بغیر حشر کے واقعہ پر یقین لانا ہے۔ یہ اعمال کے اخروی نتائج کی حقیقت کا اس وقت اقرار کرنا ہے جب کہ ابھی وہ ظاہر نہیں ہوئے۔ یہ خدا کے ظہور سے پہلے خدا کے جلال و جبروت کے آگے جھک جانا ہے۔ یہ کلمہ معرفت کا کلمہ ہے، اور معرفت بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔

لاعیش اِلّاعیش الآخرۃ

قرآن میں مختلف انداز سے جنّت کی راحتوں سے بھری ہوئی زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک مقام پر جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے : نعم الثواب وحسنت مرتفقا (وہ کیسا اچھا انعام ہے اور کیسی اچھی رہنے کی جگہ) الکہف ۳۱

ہر آدمی خوشی اور آرام کی زندگی چاہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف خوشی اور آرام کے سامان پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی پوری طاقت ان چیزوں کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ مگر جب وہ ان چیزوں کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اب وہ جانتا ہے کہ راحت کے ہر قسم کے سامان کے باوجود وہ راحت کی زندگی سے محروم ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو سامانِ راحت کو تلاش کرنے کی خوشی تو ملتی ہے مگر سامانِ راحت سے متمتع ہونے کی خوشی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں راحت کا صرف تعارف ہے، راحت سے تمتع (enjoyment) موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن نہیں۔ راحت سے متمتع ہونے کے لیے ایک کامل دنیا درکار ہے۔ موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص یہاں راحت سے متمتع ہو سکے۔

آدمی کے اس مطلوب کو پانے کا مقام صرف آخرت ہے۔ آخرت ایک کامل دنیا ہوگی۔ وہاں راحت کے تمام سامان اپنی آخری معیاری صورت میں فراہم کیے جائیں گے۔ یہ دنیا وقتی نہیں ہوگی بلکہ ابدی ہوگی۔ اسی کے ساتھ خود انسان کی وہ تمام محدودیتیں (limitations) ختم کر دی جائیں گی جو سامان راحت سے حقیقی تمتع میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ان انتظامات کے بعد پہلی بار انسان کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی زندگی کو بھرپور طور پر پا سکے۔

آخرت کے لیے عمل کرنا اس شخص کے لیے ممکن ہوتا ہے جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اہمیت دے۔ جو دکھائی دینے والی چیزوں سے گزر کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں میں جی لگائے۔ جو آج کے فائدے کے مقابلہ میں کل کے فائدہ کو ترجیح دے۔ جو اپنی ذات میں گم ہونے کے بجائے خدا میں گم ہو جائے۔

بھلانے کی ضرورت

خارش کو کھجانے سے خارش بڑھتی ہے۔ مگر جس آدمی کو خارش ہو وہ کھجائے بغیر نہیں رہتا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ تلخ تجربات کا ہے۔ تلخ تجربات کو یاد کرنا صرف نقصان میں اضافہ کرنا ہے۔ مگر اکثر لوگ تلخ تجربات کو اپنی یادوں سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ زندگی ایک اعتبار سے، ناخوش گوار واقعات کا دوسرا نام ہے۔ ایسی حالت میں تلخیوں کو اور ناخوش گواریوں کو یاد رکھنا اپنے ذہن پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا ہے۔ جو قصہ ماضی میں پیش آیا اس کو حال میں یاد رکھنا صرف اپنے دکھ کا تسلسل جاری رکھنا ہے۔ اس کو کسی طرح عقل مندی نہیں کہا جا سکتا۔

آپ کے ساتھ برا سلوک دوسرا شخص کرتا ہے، مگر اس برے سلوک کی یاد خود آپ کے اختیار کی چیز ہے۔ پھر جو کچھ آپ کے دشمن نے کیا، وہی آپ خود اپنے خلاف کیوں کریں۔

ماضی کی تلخیوں کو یاد رکھنا آدمی کے ذہن کو منتشر کرنا ہے۔ وہ آدمی کی صحت کو برباد کرتا ہے۔ وہ آدمی سے اس کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کر سکے۔ پھر آدمی کیوں اپنے آپ کو اس دہرے نقصان میں مبتلا کرے۔

اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی یہ لازمی شرط ہے کہ آدمی بھلانے کی عادت ڈالے۔ وہ گزرے ہوئے تلخ تجربات کو بھول جائے۔ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے غم میں اپنے آپ کو نہ گھلائے۔ لوگوں کی اشتعال انگیز باتوں کو سن کر وہ اپنے سکون کو برہم نہ ہونے دے۔ اس قسم کی تمام چیزوں سے غیر متاثر رہ کر اپنا کام کرنا، یہ زندگی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ اور جو لوگ اس راز کو جانیں وہی اس دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

کھوئے ہوئے کی تلافی اپنے اختیار میں نہیں، مگر کھوئے ہوئے کو بھلا دینا اپنے اختیار میں ہے۔ ناخوش گوار الفاظ کو فضا سے نکالنا اپنے اختیار میں نہیں، لیکن یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ ناخوش گوار الفاظ کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ پھر آپ کیوں نہ ایسا کریں کہ ناممکن سے اپنی توجہ کو ہٹا لیں اور ممکن کے حصول کے لیے اپنی ساری توجہ لگا دیں۔

انسان کدھر

ہندستان کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی (۱۹۴۴-۱۹۹۱) پارلیمنٹ کے دسویں الیکشن (مئی ۱۹۹۱) کی مہم چلا رہے تھے۔ وہ ملک کا طوفانی دورہ کرتے ہوئے ۲۱ مئی ۱۹۹۱ کو اپنے مخصوص ہوائی جہاز کے ذریعہ تامل ناڈو پہونچے۔ وہ ہوائی اڈہ مینم پکم (Meenampakkam) پر اترے۔ یہاں وہ اپنی بلٹ پروف گاڑی میں بیٹھے اور ۳۰ سے زیادہ کاروں کے قافلہ کے ساتھ سری پرم بودور (Sriperumbudur) کے لیے روانہ ہوئے جہاں انھیں ایک الکشن میٹنگ کو خطاب کرنا تھا۔

رات کو ۱۰ بجے وہ پنڈال کے اندر عوام کی طرف سے گلدستے وصول کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک ۲۵ سالہ عورت اپنے دونوں ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ لیے ہوئے راجیو گاندھی کی طرف بڑھی۔ راجیو بھی احساس فتح کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ کیوں کہ ہر جگہ عوامی استقبال نے انھیں یقین دلایا تھا کہ اس الکشن کے بعد وہ ملک کے وزیر اعظم بننے والے ہیں۔

عورت نے قریب آکر اپنا گلدستہ راجیو گاندھی کی طرف بڑھایا۔ مگر اس عورت کا تعلق خودکشی دستہ suicide squad سے تھا اور وہ اپنے جسم پر خطرناک بم باندھے ہوئے تھی۔ راجیو گاندھی نے گلدستہ اپنے ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ بم پھٹ گیا۔ راجیو گاندھی پوری طرح اس کی زد میں آگیے۔ ان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اسی لمحہ ان کی موت واقع ہوگئی۔

بظاہر یہ بم کا دھماکہ تھا، مگر حقیقۃً وہ موت کا دھماکہ تھا جو ہر انسان کے لیے مقدر ہے۔ اس اعتبار سے یہ صرف راجیو گاندھی کی کہانی نہیں بلکہ ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر آدمی کا ہاتھ خوشیوں کے گلدستہ پر ہے۔ مگر اصل حقیقت اس کی امیدوں کے بالکل برعکس ہے ——— جس چیز کو آدمی گلدستہ سمجھ کر وصول کر رہا ہے وہ اس کے لیے ہلاکت کا بم ہے۔

اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو موت سے پہلے اپنے رب کی معرفت حاصل ہوئی جنھوں نے اپنی زندگی کو رب کائنات کی اطاعت میں گزارا۔ جن کی موت اس حال میں آئی کہ وہ اپنے پرچۂ امتحان کو کامیابی کے ساتھ حل کر چکے تھے۔

سفری کلاس (Class on wheels)

۳ جون ۲۰۰۴ کو کچھ لوگوں کے ساتھ ایک سفر ہوا۔ یہ عام سفروں سے مختلف ایک سفر تھا۔ زیادہ درست طور پر اس کو سفری کلاس (class on wheels) کہہ سکتے ہیں۔ یہ سفر بلند شہر کے علاقہ میں ہوا۔

بلند شہر دہلی کے جنوب مشرقی سمت میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ۱۰۱۸ میں ہندو راجہ کے قبضہ سے نکل کر محمود غزنوی کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں لڑائی ہوئی اور وہ مغل سلطنت کے دائرہ میں آگیا۔ ۱۸۰۵ میں وہ برٹش انڈیا کا ایک حصہ بنا۔

The area passed from a Hindu raja to Mahmud of Ghazna in 1018, was fought over during the 14th century and then fell under Mughal rule. In 1805 it became part of British India.

اس سفر کا محرک مسٹر کرپال سنگھ (۶۱ سال) تھے۔ کرپال سنگھ بلسوری ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں۔ یہ مقام دہلی سے ۷۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ کرپال سنگھ پہلے فوج میں تھے۔ پھر وہ پولس کی ملازمت میں بھرتی ہوئے۔ پچھلے سال وہ ہیڈ کانسٹبل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی ڈیوٹی دہلی میں تھی اور وہ اکثر ہمارے یہاں آتے جاتے تھے۔ ان کی دیانت داری اور فرض شناسی اور انسانیت کی وجہ سے مجھے ان سے کافی دلچسپی ہوگئی۔

۳ جون کو ان کی لڑکی نیتو رانی کی شادی تھی۔ مسٹر کرپال سنگھ نے انتہائی عقیدت کے ساتھ مجھے اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی۔ اس وقت ان کے دل کی کیفیت یہ تھی کہ جب انھوں نے چھپا ہوا کارڈ مجھے دیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھے ان کا دل توڑنا گوارا نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے وعدہ کرلیا کہ میں انشاء اللہ آپ کی تقریب میں شرکت کروں گا۔ اس کے مطابق، ۳ جون ۲۰۰۴ کی صبح میں یہ سفر ہوا اور اسی دن شام کو واپسی ہوئی۔

پچھلے چار سال سے میں دہلی میں ایک کلاس چلا رہا ہوں جس کا نام اسپریچول کلاس (spiritual class) ہے۔ اس کلاس میں انگریزی تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ ہماری اس کلاس کے ممبران کو معلوم ہوا تو ان میں سے کئی لوگ میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کیوں کہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جب وہ میرے ساتھ ہوں تو وہ میری ہر بات کو نوٹ کریں۔ چنانچہ یہ سفر ایک نئے قسم کا سفر بن گیا۔ اس کو سفری کلاس (class on wheels) کہا جا سکتا ہے۔

اسپریچول کلاس دراصل ایک خاص تصور اصلاح پر قائم ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ دہلی کے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں کے اندر اسلام کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر چاہتے تھے۔ ان کو دہلی کے کسی مسلمان نے بتایا کہ تم لوگ جماعت اسلامی کے دفتر جاؤ، وہاں تم کو اپنے مقصد کے مطابق کتابیں مل جائیں گی۔ چنانچہ وہ جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر گئے اور وہاں کے ذمہ داروں سے ملے۔ انھوں نے ان ہندو نوجوانوں کو ۱۵ کتابیں دیں۔ یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں کا انگریزی ترجمہ تھا۔ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد وہ دوبارہ جماعت اسلامی کے ذمہ داروں سے ملے۔ انھوں نے انھیں بتایا کہ آپ کی یہ کتابیں ہم نے پڑھیں مگر یہ کتابیں ہمارے مائنڈ (mind) کو ایڈریس نہیں کرتیں۔

These books do not address our mind

انھوں نے کہا کہ یہ کتابیں مسلم مائنڈ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں جو پہلے ہی سے بطور عقیدہ اسلام کی سچائی کو مانتے ہیں۔ جب کہ ہمارا کیس یہ ہے کہ ہم اسلام کی سچائی کو بطور عقیدہ نہیں بلکہ بطور دلیل آبجیکٹیو طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہم سچائی کے متلاشی ہیں اور ہم نے دوسرے مذہبوں اور فلسفوں کو پڑھا ہے اور اب ہم اسلام کو اس حیثیت سے پڑھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ عقلی بنیاد پر پورا اتر رہا ہے یا دوسرے مذہبوں کی طرح وہ بھی ایک عقیدہ (dogma) کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ نوجوان وہاں سے مایوس ہو کر واپس ہو گئے۔ پھر ان کی ملاقات جمیل احمد الیاسی سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میرے علم کے مطابق، دنیا میں صرف ایک ہی مسلم عالم ہے جس کی کتاب تم

لوگوں کو مطمئن کر سکتی ہے۔ انھوں نے میرا نام بتایا۔ یہ نوجوان میرے پاس آئے۔ میں نے ان لوگوں کو نہ صرف اپنی کتابیں پڑھنے کو دیں بلکہ ان کو اپنے ہفتہ وار اسپریچول کلاس میں شامل کرلیا۔ اب یہ نوجوان مکمل طور پر اسلام کی صداقت پر مطمئن ہو چکے ہیں اور وہ ہمارے مشن کے باقاعدہ ممبر ہیں۔

اس تجربہ سے مجھے ایک نئی حقیقت دریافت ہوئی۔ مسلمانوں میں جو مصلحین اٹھے انھوں نے زیادہ تر جلسوں اور اجتماعات کو خطاب کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ گویا کہ ان کا طریقہ بھیڑ (crowd) کو ایڈریس کرنا تھا۔ مگر یہ تجربہ اپنے مقصد کے اعتبار سے ناکام رہا۔ اسپریچول کلاس کے تجربہ کے ذریعہ مجھے معلوم ہوا کہ اصلاح یا قرآن کے الفاظ میں تزکیہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انفرادی ذہن کو ایڈریس کیا جائے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ اصلاح کا مقصد حقیقی طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس تجربہ کے ذریعہ میں نے ایک معلوم حقیقت کو دوبارہ دریافت کیا۔ وہ یہ کہ، مشہور حدیث کے مطابق، ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی بے آمیز فطرت پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر انسان کو مسٹر نیچر کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد اس کا ماحول اس کو ''یہودی یا مجوسی یا نصرانی'' بنا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ایک کنڈیشنڈ کیس بن جاتا ہے۔

ایسی حالت میں سب سے پہلا کام ہر آدمی کی کنڈیشننگ کو توڑنا ہے۔ گویا اصلاح و تزکیہ کا کام ذہن کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) سے شروع ہوتا ہے، نہ کہ عمومی تقریر یا وعظ خوانی سے۔

ہماری اسپریچول کلاس میں جو ہندو نوجوان شریک ہوتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم اس کلاس میں شرکت سے پہلے اسلام اور مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام ہمارے لئے کوئی پسندیدہ مذہب بن سکتا ہے۔ ہم تو آپ کے پاس روحانیت (spirituality) کی تلاش میں آئے تھے۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ اسلام کا مطالعہ اسلام کے بارے میں ہمارے منفی ذہن کو مزید پختہ کردے گا۔ مگر آپ نے ہمارے اوپر ڈی کنڈیشننگ کا جو پراسس چلایا اس کے بعد ہی یہ ممکن

ہوا کہ ہم اسلام کی تصویر کو اس کی اصلی صورت میں دیکھ سکیں۔ گویا کہ یہ لوگ اسپریچولٹی کے راستہ سے اسلام تک پہنچے۔

اسپریچول کلاس سے ایک اور بات مجھے معلوم ہوئی۔ یہ نوجوان میری کلاس میں آنے لگے تو میں اپنی عادت کے مطابق، ایسا نہیں کرتا تھا کہ ان سے میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بلکہ میں شدید الفاظ میں ان کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں اپنے ماں باپ کی طرف سے پیمپرنگ (pampering) کے عادی تھے لیکن میرے یہاں اس کے برعکس انہیں ہیمرنگ (hammering) کا تجربہ ہوا۔ ابتدا میں وہ لوگ اس سخت تجربہ سے گھبرائے۔ مگر وہ برابر ہماری کلاس میں آتے رہے کہ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔

آخرکار اب وہ کھلے طور پر مانتے ہیں کہ میری ہیمرنگ سے ان کو وہ فائدہ ہوا جو انہیں ان کے ماں باپ کی پیمپرنگ سے نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہوا تھا۔ ہماری کلاس کی ایک خاتون پریا ملک بمبئی گئیں۔ وہاں ایک مسلمان سے ان کی گفتگو ہوئی۔ پریا ملک نے اسلام کے بارے میں جو گہری باتیں بتائیں اس کو سن کر مسلمان کو بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ ایک ہندو فیملی میں پیدا ہوئیں پھر اسلام کے بارے میں آپ کے اندر اتنی کلارٹی (clarity) کہاں سے آئی۔ پریا ملک نے جواب دیا کہ اس کا راز صرف ایک ہے اور وہ ہے:

hammering, hammering, hammering.....

اس سفر یا بالفاظ دیگر سفری کلاس (calss on wheels) میں حسب ذیل افراد شریک تھے — محمد خالد انصاری، ڈاکٹر پردھان، رجت ملہوترا، پریا ملک، استھی ملہوترا، منجو ورمانی، فریدہ خانم۔ یہ قافلہ ایک کوالس گاڑی میں سوار ہو کر ۳ جون کی صبح کو دہلی سے بلسوری (ضلع بلند شہر) کے لئے روانہ ہوا۔ پورے راستہ میں تعلیم و تعلّم کا تقریباً وہی طریقہ رائج رہا جو ہماری ہفتہ وار کلاس میں دہلی میں ہوتا ہے۔

۳ جون ۲۰۰۴ کی صبح کو ۱۰ بجے نظام الدین سے روانگی ہوئی۔ روانہ ہوتے ہی سفری کلاس

کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہم اس سفر کا آغاز ایک دعا سے کریں گے۔ میں اس دعا کے الفاظ دہراتا ہوں اور آپ سب لوگ اس کو سن کر اسی طرح اس کو دہرائیں، جیسا کہ میں نے کہا ہے: سبحان الذی سخر لنا هذا وما کنّا له مقرنین۔ وانّا الی ربنا لمنقلبون (الزخرف ۱۳-۱۴)

یہ قرآن کی آیت ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے: پاک ہے وہ جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا، اور ہم ایسے نہ تھے کہ ان کو قابو میں کرتے۔ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اس کے بعد میں نے لوگوں کو پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک دعا بتائی جو سفر سے تعلق رکھتی ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سفر پر روانہ ہوئے تو آپ نے یہ دعا پڑھی:

اللهم انی اسألک فی سفری هذا البرّ والتقویٰ، ومن العمل ما ترضیٰ، اللهم هوّن لنا السفر واطوِ لنا البعید، اللهم انت الصاحب فی السفر والخلیفة في الأهل، اللهم اصحبنا في سفرنا واخلفنا فی اهلنا (مسند احمد ۱۴۴/۲)

اس دعا کا ترجمہ یہ ہے:

اے اللہ، ہم اس سفر میں تجھ سے سوال کرتے ہیں نیکی کا اور تقویٰ کا، اور ایسے عمل کا جس سے تو راضی ہو۔ اے اللہ، تو ہمارے لئے سفر کو آسان کر دے اور ہمارے لئے دوری کو کم کر دے۔ اے اللہ، تو اس سفر میں ہمارا رفیق ہے اور تو ہمارے گھر والوں کا نگہبان ہے۔ اے اللہ، تو ہمارے سفر میں ہمارا ساتھ دے اور ہمارے بعد ہمارے گھر والوں کی خبر گیری فرما۔

پھر میں نے کہا کہ قرآن کی جو آیت ہم نے پڑھی اس میں تسخیر کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی خدا نے کچھ چیزوں کو اس طرح ہمارے تابع کر دیا ہے کہ ہم ان کو اپنے سفر کے لئے استعمال کریں اور ان پر سواری کر کے دور کے مقامات پر آسانی کے ساتھ پہنچ سکیں۔ دوسری مخلوقات، مثلاً جانور اپنا سفر خود اپنے آپ کرتے ہیں۔ یہ انسان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے سفر کے لئے دوسری

چیزوں کو بطور سواری استعمال کرتا ہے۔

خدا نے کچھ جانوروں، مثلاً گھوڑے اور اونٹ کو فطری طور پر ایسا بنایا ہے کہ وہ انسان کے تابع بن جائیں اور انسان کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر دور کے مقامات تک لے جاسکیں۔ پھر وہ وقت آیا جب کہ انسان نے پہیئے (wheels) دریافت کیے اور بیل گاڑی اور گھوڑا گاڑی اور اونٹ گاڑی بنا کر ان پر سفر کرنے لگا۔ اسی طرح خدا نے پانی کے لئے ایک ایسا قانون مقرر کیا کہ جس کے ذریعہ یہ ممکن ہوا کہ انسان کشتی جیسی سواری بنا کر اس میں بیٹھے اور پانی کو اپنے لئے کھلی سڑک کے طور پر استعمال کرے۔

اسی طرح خدا نے غیر ذی روح اشیاء اور معدنیات میں ایسے خواص (properties) رکھ دیں کہ انسان اپنی عقل کو استعمال کر کے انھیں تیز رفتار سواری میں ڈھال سکے۔ اس طرح ایک نئی انجینئرنگ وجود میں آئی۔ انسان نے اپنی عقلی صلاحیت کو استعمال کر کے ان قوانین فطرت کو دریافت کیا اور پھر ریلوے، اسٹیم شپ، موٹر کار، اور ہوائی جہاز جیسی سواریاں وجود میں آئیں۔

ہماری یہ گاڑی جس میں ہم اس وقت سفر کر رہے ہیں وہ بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ یہ گاڑی کیا ہے۔ یہ ہے مادہ کا مشین میں تبدیل ہو کر زمین پر دوڑنا۔ غیر متحرک چیزوں کا متحرک صورت اختیار کر لینا۔ یہ سواری خدا کی ایک ایسی رحمت ہے جو ساری کائنات میں انسان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ جب ہم گاڑی میں سفر کریں تو یہ احساس ہمارے اوپر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ہمارا دل شکر کے احساس سے بھر جائے۔ جب ایسا ہوگا تو ہمارا پورا سفر ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت بن جائے گا۔ میں نے کہا کہ شکر کیا ہے۔ شکر دراصل دینے والے عطیہ کا اعتراف (acknowledgement) ہے۔ یہ اعتراف بلاشبہ سب سے بڑی انسانی صفت ہے۔ اعتراف کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے اندر سوچنے کی صلاحیت زندہ ہے۔ وہ دیانت دار (honest) ہے۔ وہ چیزوں کو سنجیدگی کے ساتھ لیتا ہے۔ وہ گھمنڈ اور منافقت سے پاک ہے۔ اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پایا جاتا ہے۔ وہ ایک سچا انسان ہے۔ وہ اس واقعہ کو مانتا ہے کہ جن چیزوں کو وہ استعمال کر رہا ہے، وہ اس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ وہ خدا کی طرف سے اس کو برائے استعمال دی گئی ہیں۔ شکر یا اعتراف ایک مکمل کردار

ہے، وہ صرف ایک لفظی تکرار کا نام نہیں۔

شکر کی یہ اسپرٹ اگر کسی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائے تو یہ اس کے لئے ایک داخلی انقلاب کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس کو وہ اعلیٰ نفسیاتی تجربہ ہونے لگے گا جس کو روحانی ارتقا (spiritual development) کہا جاتا ہے۔

دہلی سے آگے بڑھا تو ہماری گاڑی اس مشہور روڈ پر تھی جس کو 'تاج اکسپریس' کہا جاتا ہے۔ یہ روڈ دہلی سے آگرہ جاتی ہے۔ اس کو 'ورلڈ کلاس روڈ' (world class road) کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ دہلی کی سڑکوں کے مقابلہ میں یہ ضرور ایک اچھا روڈ ہے مگر میرے تجربہ کے مطابق، وہ ورلڈ کلاس روڈ (world class road) نہیں۔ ہماری گاڑی کے ساتھ وہ جھٹکے تو نہیں لگ رہے تھے جس کا تجربہ بہار کی سڑکوں پر ہوتا ہے۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ ہماری گاڑی برابر اوپر نیچے ہو رہی ہے۔ باہر کے ملکوں میں میں نے بار بار ورلڈ کلاس (world class) سڑکوں پر سفر کیا ہے۔ وہاں میں نے پایا ہے کہ گاڑی بالکل اسموتھ (smooth) انداز میں چلتی رہتی ہے۔ ہلکا سا جھٹکا بھی نہیں لگتا۔ جب کہ اس سڑک پر ایسا نہیں تھا۔

آج کل انڈیا میں ورلڈ کلاس چیزوں کا بہت چرچا ہے۔ ورلڈ کلاس شہر، ورلڈ کلاس روڈ، ورلڈ کلاس ایرپورٹ، ورلڈ کلاس یہ اور ورلڈ کلاس وہ۔ مگر انڈیا میں کرپشن اتنا بڑھ چکا ہے کہ یہاں کوئی بھی ورلڈ کلاس پلان صرف کرپشن کی نئی صورت بن جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج کل ورلڈ کلاس تعمیرات کی جو باتیں ہو رہی ہیں وہ صرف لوٹ (loot) کو بڑھائیں گی، کچھ لوگ زیادہ امیر بن جائیں گے اور جو لوگ غریب ہیں وہ اپنی پچھلی حالت میں پڑے رہیں گے۔

انڈیا میں ایک نعرہ کا بہت چرچا ہے اور وہ ہے غریبی ہٹاؤ (eradication of poverty) مگر میرے نزدیک یہ اصل بات نہیں۔ انڈیا میں کرنے کا اصل کام کرپشن ہٹاؤ (eradication of corruption) ہے۔ انڈیا میں جب تک کرپشن ہے یہاں حقیقی معنوں میں کوئی بھی ترقی ہونے والی نہیں۔ تاج اکسپریس تقریباً پچیس کیلومیٹر تک ہمارے ساتھ تھی۔ اس کے بعد دوسرا روڈ آ گیا۔ یہ روڈ ویسا ہی تھا

جیسا کہ عام طور پر انڈیا میں ہوتا ہے۔

ہماری گاڑی آگے بڑھی تو میں نے لوگوں سے کہا کہ ہر شریک سفر اپنے بارے میں مختصر طور پر بتائے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہماری اسپریچول کلاس میں پچھلے تقریباً چار سال سے برابر شریک رہے ہیں۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ ہر ایک اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں بتائے کہ کلاس میں شرکت سے اس نے کیا سیکھا اور کیا جانا۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنی اپنی بات بتائی۔ ہر ایک کی بات اس کے اپنے الفاظ میں یہاں نقل کی جارہی ہے۔

محمد خالد انصاری: مولانا وحید الدین سے ملنے سے پہلے اسلام میرے لئے صرف ایک عقیدہ (ritualistic faith) تھا۔ بچپن میں والدین اور قریبی رشتہ داروں نے جو کچھ مجھ کو مذہب کے بارے میں بتایا اس کو میں نے فائنل سمجھ کر مان لیا۔ جب بھی کبھی دماغ میں کوئی سوال آیا، یا تو اس کا غیر تشفی بخش جواب ملا یا پھر یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ مذہب کے بارے میں سوال نہیں کیا جاتا۔ اگر دلیل مانگو گے تو تم ایمان سے خارج ہو جاؤ گے۔ کچھ بنیادی سوالات جن کا تعلق خدا کیا ہے، ہماری اس موجودہ زندگی کا کیا مقصد ہے، جنت ہے تو کیوں ہے اور کہاں ہے، وغیرہ وغیرہ، کا کبھی بھی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ مولانا وحید الدین سے جب میں ملا تو میں نے ان سے بھی یہی بنیادی سوال کئے۔ ان سوالات کے جواب مولانا نے دینے شروع کئے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے دو اور چیزیں بتائیں: آرٹ آف اینلسس (art of analysis) اور انٹیلکچول ڈیولپمنٹ (intellectual development)۔ یہ دونوں چیزیں بغیر ہیمرنگ (hammering) کے ممکن نہیں تھیں۔

چوں کہ مجھے اپنے سوالوں کے جوابات سیدھے اور جلدی چاہئے تھے اس لئے مولانا کا بتایا ہوا فارمولا شروع میں مجھے اپیل نہیں کیا۔ جب بھی میں کوئی سوال کرتا اور اپنی رائے دیتا تو مولانا فوراً میری (hammering) کرنے لگتے۔ اس سے کئی بار ڈس اپائنٹمنٹ (disappointment) بھی ہوا۔ لیکن لرننگ پراسس (learning process) جاری رہنے کی وجہ سے بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ مولانا کی ہیمرنگ (hammering) بے وجہ نہیں تھی۔ چوں کہ میرا دماغ بچپن سے ایک خاص ماحول

میں پلنے کی وجہ سے کچھ خیالات کے ساتھ conditioned (متاثر سوچ) والا ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کی ڈی کنڈیشننگ (deconditioning) کے لئے مولانا کی ہیمرنگ (hammering) سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ ۳ مہینے اس پراسس سے گزرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جن سوالوں کے جواب مجھے دلیل اور سائنٹفک ریزننگ کے ساتھ چاہئے تھے وہ مولانا نے اس طرح سے دئے کہ نہ صرف وہ چند سوالات بلکہ مزید سوالات جو میرے ذہن میں تھے، ان کے بھی جوابات مجھے تسلی بخش طریقہ سے مل گئے۔ اس ڈی کنڈیشننگ کے عمل کے نتیجہ میں میرے ذہن میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ جو مذہب اور یقین میرے لئے صرف رواجی تھا وہ شعوری بن گیا۔ پہلے میں خدا، اس کا کریشن پلان اور آخرت کی زندگی کو ایک کہانی جیسی چیز سمجھ کر زندگی گزارتا تھا۔ لیکن مولانا کی گائڈینس (guidance) نے اس یقین کو اتنا حقیقی بنا دیا کہ آج ہر کام کرنے سے پہلے یہ خیال دل میں آتا ہے کہ اس کام کا نتیجہ جنت کے لئے مجھے کوالیفائی (qualify) کرے گا یا ڈس کوالیفائی (disqualify) کر دے گا۔

پچھلے چار سال کے دوران مولانا سے جو اسپریچول وزڈم (spiritual wisdom) مجھے ملی وہ میرے لئے اسلام کی ری ڈسکوری (rediscovery) بن گئی۔

رجت ملہوترا: جب میں تین سال پہلے مولانا سے ملا تب میرے ذہن کو دو چیزیں پریشان کرتی تھیں۔ مسلمان اور اسلام سے نفرت اور دوسرا یہ کہ میرے وجود کا مقصد کیا ہے۔ اسی نفرت اور کنفیوزن (confusion) میں میں بڑا ہوا۔ میں نے اپنی زندگی کے مقصد کے بارے میں لوگوں سے گفتگو کی اور کتابیں پڑھیں لیکن کوئی آدمی بھی میرے سوالات کا تشفی بخش جواب نہ دے سکا۔ جب میں مولانا سے ۳ سال پہلے ملا تو انھوں نے مذہب اسلام کا صحیح چہرہ میرے سامنے رکھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں مسلمان اور اسلام میں فرق کرنا چاہیے۔ ہمیں مسلمان کو اسلام کی لائٹ میں جانچنا چاہئے نہ کہ اسلام کو مسلمانوں کی لائٹ میں:

We should not judge Islam in the light of Muslims,
rather we should judge Muslims in the light of Islam.

اسلام سے ہی مجھے خدا کا کریشن پلان (creation plan) معلوم ہوا اور مجھے اپنے جینے کا مقصد ملا۔ جنت اور دوزخ جو پہلے میرے لئے تصوراتی دنیا(imaginary world) تھے اب میرے لئے وہ حقیقت ہیں۔ اور میں اب اپنے ہر عمل کو دیکھتا ہوں کہ یہ مجھے جنت میں لے جائے گا یا جہنم میں۔ اس طرح میری نفرت پیار میں بدل گئی اور اب میرے لئے ہر انسان اسی خدا کا کریشن ہے جس کا ایک حصہ میں خود ہوں۔ قرآن جس کو میں پہلے کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا اب وہ میرے لئے زندگی کی گائیڈ بک(guide book) بن گیا ہے۔ ان سب وجہوں سے میں آج یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری شخصیت میں 360 ڈگری تبدیلی آچکی ہے۔ اور یہ سب مولانا کی انتھک کوششوں سے ہوا۔ مولانا نے مجھے انٹیلکچول لیول(intellectual level) پر میرے مائنڈ کو ایڈریس(address) کیا جسے کوئی بھی نہیں کرسکا تھا۔ اور اب میری خدا سے یہی دعا ہے کہ میری طرح کے سب نوجوان اسی طرح بدل جائیں۔ ان کی نفرت اور کنفیوزن(confusion) محبت اور اسپریچول ڈسکوری(spiritual discovery) میں بدل جائے۔

استھی ملہوترا: یکم اکتوبر ۲۰۰۲ میری زندگی کا ٹرننگ پائنٹ(turning point) تھا۔ اس دن نے میری زندگی کے معنٰی بدل دئے۔ میں بہت وہمی(superstitious) لڑکی تھی جس کا دن مندر سے شروع ہوتا تھا۔ صبح صبح تیار ہوکر میں اپنے بھگوان سے مندر میں ملنے جایا کرتی تھی جو کہ روزانہ کی پریکٹس بن گئی تھی۔ سپرسٹیشن (superstition) کی یہ حد تھی کہ میرے کپڑے دنوں کے حساب سے ہوتے تھے۔ جہاں بھی کوئی مسئلہ ہوتا میں اپنے بھگوان سے شکایت کرتی اور اس کا حل ڈھونڈنے کے لئے مندر جاتی۔ لیکن مولانا سے ملنے کے بعد میرے اندر یہ سوالات اٹھنے لگے تھے کہ کیا مجھے میرے بھگوان سے ملنے کے لئے مندر جانا پڑے گا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مندر کے اتنے چکر کاٹ کر بھی کیوں میرے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ مولانا سے ملنے کے بعد مجھے سمجھ آیا کہ یہ سارے مسئلے مسئلے نہیں بلکہ ٹسٹ کے پرچے ہیں۔ جن کو اگر ٹولیریٹ کریں گے تو اس کا ریوارڈ(reward) ہم کو جنت کی شکل میں ملے گا۔ مولانا سے ملنے کے بعد مجھے خدا کا کریشن پلان سمجھ میں آیا اور میری کرٹسزم والی اپروچ تجزیاتی اپروچ میں بدل گئی۔ مجھے وہ سچائی مل گئی جس کی میری آتما کو تلاش تھی۔

فریدہ خانم: میں ان اسپریچول کلاس کو تین سال سے اٹنڈ کر رہی ہوں۔ اور آج میں اپنے آپ کو ایک بدلا ہوا انسان پاتی ہوں۔ میں خدا کے فضل سے ایک مسلمان گھر میں پیدا ہوئی۔ میری تعلیم مسلم اداروں میں ہوئی۔ میں اسلامک اسٹڈیز کی استاد ہوں۔ مزید یہ کہ میں نے مولانا کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کیا ہے۔ لیکن ان ساری معلومات کے باوجود مجھے معرفت والا اسلام حاصل نہیں تھا۔ معرفت والا اسلام مجھے ان اسپریچول کلاسز میں شرکت سے ملا۔

چوں کہ کلاسز ریگولر ہوتی تھیں۔ بار بار لوگ سوالات اٹھاتے تھے۔ یعنی جو سوالات اور شبہات آج کے انسان کے ذہن میں ہیں۔ سائنسی دور سے پہلے لوگ مذہب کے معاملہ میں سوال نہیں کرتے تھے۔ وہ عقیدہ کے طور پر مذہبی تعلیمات کو مان لیتے تھے۔ اس کلاس کی اس خصوصیت سے کہ سوال اٹھانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ کیوں کہ صرف کوئی کتاب پڑھ لینے سے وہ کبھی بھی میرے ذہن کا حصہ نہیں بن جاتی جب تک کہ میں اس کے مضمون (content) کو لاجیکل انداز سے گہرائی سے نہ سمجھ لوں۔ اس کلاس میں مجھے ہر بات کی عقلی توجیہ (rational explanation) ملتی اور وہ میرے ذہن کا حصہ بن جاتی۔

سب سے پہلی بات جو میرے ذہن میں پوری طرح کلیر (clear) ہوئی وہ یہ کہ یہ دنیا انسان کا ٹسٹ لینے کے لئے ڈیزائن (design) کی گئی ہے۔ یہاں جو کچھ کسی کو ملا ہوا ہے وہ اس کا ٹسٹ پیپر ہے۔ اگر کسی کو کم ملا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ہلکا ٹسٹ پیپر دیا گیا ہے۔ اس بات کو نہ سمجھنے سے لوگ مسلسل ایک دوسرے کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ میرا بھی پہلے یہی حال تھا۔ اب اگر کوئی چیز مجھے کم ملی ہوئی ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ یہی میرے حق میں بہتر ہے۔ کیوں کہ دنیا کے کسی ٹسٹ (test) میں کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اس کو مشکل پیپر دیا جائے۔ ہر آدمی جو کسی ٹسٹ میں بیٹھتا ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کو آسان پیپر ملے تا کہ وہ ٹسٹ کو آسانی کے ساتھ کلیر کر لے۔ لہٰذا اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد کہ دنیا کی پوری زندگی ایک ٹسٹ پیپر ہے، میری سوچ بالکل بدل گئی ہے۔ اب مجھے جو کچھ بھی ملا ہوا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ اس کی وجہ سے اب میرے اندر جھنجھلاہٹ ختم ہوگئی۔ میرے اندر

پازیٹیو تھنکنگ آ گئی اور میں ہر وقت لوگوں کو معاف کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتی ہوں۔ یہ تھا اس دنیا کے بارے میں ہمارا نظریہ (attitude)۔ لیکن اصل چیز جو ہمیں اس کلاس سے ملی وہ تھی، خدا سے گہرا تعلق اور جنت کا حریص ہو جانا۔ ہر مسلمان جنت کی آرزو رکھتا ہے اور جنت کے لئے دعا مانگتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اسی طرح اپنے ماں باپ سے اور اپنے ماحول سے سنتے چلے آرہے ہیں اور ان الفاظ کو وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہیں۔ اس کلاس نے ہمارے لئے خدا اور جنت اور آخرت کو اپنی ڈسکوری (discovery) بنادیا۔ ہم نے گہرائی سے ان حقیقتوں کو سمجھا اور ان کو شعوری طور پر دریافت کیا۔ ان کو اپنے شعوری مائنڈ کا ایک حصہ بنایا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کوئی لمحہ نہیں ہوتا جب ہم خدا سے غافل ہوں۔ جب ہم جنت کی یاد نہ کر رہے ہوں۔ جب ہم دنیا کی تکلیفوں پر صرف اس لئے نہ صبر کر رہے ہوں کہ خدا کے یہاں اس کا بے حساب اجر ملے گا۔ ہم کو لوگوں سے شکایت ہوتی ہے لیکن پھر ان سے جڑے رہتے ہیں کہ یہی خدا کا حکم ہے۔ خدا کے آگے اپنے آپ کو پوری طرح سرنڈر کر دینا۔

ہماری مرضی، ہماری خواہشات کتنا ہی ہمیں کسی دوسرے راستہ پر جانے کو کہیں لیکن اگر ہماری خواہشات خدا کی مرضی کے خلاف ہیں تو ہمارے ذہن کے کسی خانہ میں بھی نہیں آتا کہ ہم بغاوت کریں اور اپنی مرضی کے مطابق اپنی ایک زندگی بنائیں۔ اس کلاس سے ہماری سمجھ میں آیا کہ جتنا زیادہ ہم صبر کریں گے خدا کے واسطے اتنا ہی زیادہ ہم اپنے نفس کو پاک کریں گے۔ اور جب تک ہم اپنے نفس کو پاک نہ کریں گے تب تک ہم جنت میں جانے کے لائق نہ ٹھہریں گے۔ ہم نے اس کو خود محسوس کیا ہے کہ صبر کرتے ہی ہمیں لگتا ہے کہ ہماری روح (soul) مزید پاکیزہ ہوگئی ہے۔ کلاس میں ہمیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے نام سے ایک پرفکٹ ورلڈ بنائی۔ اس پرفکٹ ورلڈ میں اللہ تعالیٰ کو پرفکٹ انسان بسانا تھا۔ اس لئے انسان کو اس دنیا میں آزمائش (trial) کے لئے بھیج دیا گیا تاکہ وہ دنیا کے تمام تحریصات (temptations) سے گزر کر اپنے ٹسٹ پر پورا اترے اور اللہ تعالیٰ کی اس عظیم لافانی نعمت کا استحقاق حاصل کرے۔

جنت حاصل کرنے کی یہ تمنا جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے، ہمیں پہلی بار اس کلاس سے معلوم ہوا کہ اس کا راستہ کدھر سے جاتا ہے۔ اس کا راستہ ہے، پریا ملک کی زبان میں:

hammering, hammering, hammering

ہیمرنگ کسی کو اچھی نہیں لگتی، اور میں کوئی استثناء نہیں۔ لیکن جنت حاصل کرنے کی زبردست خواہش نے ہمارے لیے اس ہیمرنگ کو آسان بنا دیا۔ بلاشبہ قیمتی جنت کی یہ بہت سستی قیمت ہے۔

محمد اقبال پردھان: میں بھٹک رہا تھا تلاش میں کہ سچا اسلام ہے کیا۔ کافی لوگوں سے سمپرک میں رہا۔ ہر جگہ اس طرح کی باتیں بتائی گئیں کہ وہ ہضم نہیں ہوتیں۔

دنیا کے دائرے میں بالکل رہ کر ہی ہر کوئی اپنی بات بتاتا تھا۔ میں بہت ہی جدوجہد میں تھا کہ کس کی بات مانوں اور کس کی نہیں۔ کچھ دین کی کتابیں پڑھیں، وہ کچھ بتاتی تھیں، مولانا لوگ کچھ اور بتاتے تھے۔

تب پریا ملک کے ذریعہ میری ملاقات مولانا وحید الدین سے ہوئی۔ یہاں آکر میں نے جانا کہ سچا اسلام کیا ہے اور اس کو زندگی میں کیسے اپنایا جا سکتا ہے۔ یہاں آکر میرے جو بھی سوال تھے ان کا جواب بنا مانگے ہی مل گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے۔ ہم کیوں یہاں آئے ہیں۔ اور کیوں سب کچھ کر رہے ہیں۔

مولانا کے یہاں ہمیں معلوم پڑا کہ ہمارا اصلی مقصد یہ دنیا جینا نہیں ہے۔ بلکہ اس دنیا میں رہ کر جنت میں جانے کی تیاری کرنا ہے اور مولانا کا ''دعوۃ مشن'' یہی کام انجام دیتا ہے۔ یہاں آکر ہمارا مقصد جنت پانا ہو گیا ہے۔ ابھی مجھے جنت میں جانے کے لئے مولانا سے بہت کچھ فیض حاصل کرنا ہے۔

منجو ورمانی: مولانا وحید الدین سے ملنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں تقریباً تیس سال سے بے مطلب زندگی جی رہی تھی۔ زندگی کے معنٰی ڈھونڈنے میں میں نے اپنی زندگی کے کئی سال

ادھر ادھر بھٹک کر بتا دیئے۔ پر ذہن میں اٹھے کئی سوالوں کا جواب صحیح معنوں میں نہیں ملا۔ جیسے کہ اس دنیا میں میں کس لئے آئی ہوں۔ میری زندگی کے کیا معنی ہیں اور اس کائنات کو بنانے والے کی کیا سچائی ہے۔ زندگی، موت اور موت کے بعد کی کیا سچائی ہے۔

جب مولانا سے میری ملاقات ہوئی تو ان سے میرے ذہن میں اٹھے اور بھی کئی سوالوں کا جواب مل گیا۔ خدا کی بنائی اس دنیا کے معنی پتہ لگے۔ یہ جانا کہ اس دنیا کا ودھاتا صرف ایک ہے اور اس کا نہ کوئی ساتھی ہے اور نہ ہی اس کے برابر کوئی ہے۔ خدا نے منش کو وہ ساری چیزیں دی ہیں جن کی آوشکتا اس کے جگ میں جیون گزارنے کے لئے ہے۔ خدا نے اس دنیا سے الگ ایک بہترین دنیا بنائی ہے۔ ہر انسان اس دنیا میں ایک امتحان دینے آیا ہے۔ خدا نے صرف انسانوں کو ہی آزادی دی ہے کہ وہ اپنی زندگی جیسے چاہے جی لے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کو مانے یا نکارے۔ جو انسان سچا ہوگا وہ خدا کو مانے گا اور صحیح راہ زندگی میں اپنائے گا۔ اسے خدا اس زندگی کے بعد جنت دے گا۔ جہاں ہمیشہ سکھ، خوشی اور شانتی ملے گی اور جو انسان خدا کو نہیں مانے گا، خدا کی دی ہوئی آزادی کا غلط استعمال کرے گا، اسے خدا موت کے بعد جہنم کی آگ میں ہمیشہ کے لئے جھونک دے گا۔

زندگی، موت اور اس کے بعد کی زندگی کی سچائی کو مولانا سے جان کر خدا سے میں دعا کرتی ہوں کہ میرے قدم زندگی کی راہ پر کبھی نہ ڈگمگائیں تاکہ میرے قدم جنت کی اور بڑھے۔ خدا سے ہمیں ہمیشہ شکر کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں ایک بہترین زندگی دی ہے جسے ہمیں صحیح راہ پر لگانا چاہئے تاکہ ہم سب زندگی کے امتحان میں پاس ہو کر جنت کی اور بڑھیں:

پریا ملک: پریا ملک نے اسپریچول کلاس کے بارے میں اپنا تاثر بتایا۔ انھوں نے اپنی بات انگریزی مین کہی۔ ان کی یہ بات الگ صفحہ پر درج کی جا رہی ہے:

Meeting Maulana Wahiduddin Khan has been turning point in my life. My life derived its full meaning after meeting Maulana. I was suffering from a complete identity crisis. I tried to do everything, which people told me, it gave them happiness, but it only brought disillusionment in my life.

A question constantly bothered me that if there was a thought of perfection and happiness in my mind, then where was that object of happiness. Every item that I possessed bored me in no time. If everything is ephemeral then what is permanent. This confusion brought me to Maulana.

Four years later all my confusions are over and I have achieved God realization at a rational level, which I thought, was totally unachievable. I no longer suffer from any identity crisis, because I can completely identify myself as a part of God's creation plan as told to me by Maulana revealed in the Islamic scriptures.

I too was conditioned like most people, out of my upbringing in a Hindu family. Maulana completely re-engineered my thought process by giving me counter reasoning which completely dislodged earlier belief system, which I was carrying in for thirty years of my life. This brought an instant U turn in my life.

I no longer seek perfection in this world, as it is non-achievable. God and paradise that were abstract in my life are now a reality.

ساتھیوں کے اظہار خیال کے بعد میں نے کہا کہ اب میں اس سلسلہ میں خود اپنا تاثر بیان کروں گا۔ میں نے کہا کہ اسپریچول کلاس جیسی کلاس چلانا کوئی یک طرفہ عمل نہیں، یہ ایک دوطرفہ عمل (bilateral process) ہے۔ یعنی اگر اس کلاس کے ذریعہ آپ کو فائدہ پہنچا، جیسا کہ آپ لوگوں نے بیان کیا ہے تو خود مجھے بھی اس کے ذریعہ بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔ اس معاملہ میں ہم دونوں فائدہ میں یکساں طور پر شریک ہیں۔

میرا تجربہ ہے کہ اگر آپ ایسا کریں کہ اوسط ذہن کے لوگوں سے ملیں اور ان سے بات کریں تو آپ کا فکری معیار زیادہ اونچا نہیں ہوگا۔ آپ دوسروں کو عوامی معیار پر خطاب کریں گے اور خود بھی آپ کی ذہنی سطح عوامی معیار پر ٹھہری رہے گی۔ لیکن اگر آپ ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان اپنا پروگرام چلائیں تو فطری طور پر ایسا ہوگا کہ آپ کا ذہنی معیار بلند ہوتا جائے گا۔ لوگ آپ سے اعلیٰ سطح کے سوالات کریں گے اور آپ کا ذہن مجبور ہوگا کہ وہ خود بھی اعلیٰ سطح پر سوچے اور زیادہ برتر سطح پر سوال کا جواب فراہم کرے۔ اس طرح آپ کا ذہن مسلسل طور پر ایک قسم کے فکری چیلنج سے دوچار رہے گا، اور فطرت کے قانون کے مطابق، یہ چیلنج آپ کے لئے ذہنی ارتقاء (intellectual development) کا ذریعہ بنا رہے گا۔ اس معاملہ پر جب میں غور کرتا ہوں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اسپریچول کلاس چلانا خود میرے لئے ذہنی ارتقاء کا سبب بنا ہے۔ کئی پہلوؤں سے میری فکر میں زیادہ وضوح (clarity) آئی ہے۔

اس کی ایک مثال روحانیت (spirituality) کا مسئلہ ہے۔ میں نے کہا کہ روحانیت کا موضوع چالیس سال سے بھی زیادہ مدت سے میری توجہ کا مرکز رہا ہے۔ مگر پچھلے سالوں میں اسپریچول کلاس کے دوران یہ موضوع جس طرح مجھ پر واضح ہوا، وہ اس سے پہلے واضح نہ تھا۔ پہلے جو چیز میرے لئے ایک فطری چیز تھی وہ اب ایک شعوری چیز بن گئی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہوں کہ روحانیت کے موضوع کی وضاحت کرسکوں۔

روحانیت کا موضوع کم از کم ۵ ہزار سال سے انسان کی تلاش کا موضوع رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تو اس موضوع نے گویا کہ فیڈ (fad) کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ فلسفہ اور مذہب اور مسٹزم اور تصوف اور یوگا والوں نے اس موضوع پر ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں۔ میں اپنی دلچسپی کی بنا پر لمبی مدت سے ان کتابوں کو پڑھتا رہا ہوں۔ مگر ان کتابوں سے مجھے اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ پچھلے چند سالوں کے دوران مجھ پر ایک نئی حقیقت کھلی جو میں نے ابھی تک نہ کبھی پڑھی تھی اور نہ کبھی سنی تھی۔ ایسا اسپریچول کلاس کے دوران ہوا۔

مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ روحانیت (spirituality) کے دو دور ہیں۔ ایک، ماقبل سائنس دور (pre scientific era) اور دوسرے مابعد سائنس دور (post scientific era) جدید حیاتیاتی سائنس کے ظہور سے پہلے یہ مانا جاتا تھا کہ انسان کے اندر دو قسم کی استعداد (faculty) پائی جاتی ہے، قلب اور دماغ۔ قلب احساس اور جذبات کا مرکز ہے، اور دماغ سوچ (thinking) کا مرکز ہے۔

اس تقسیم کی بنا پر روحانیت ایک قلب پر مبنی (heart-based) ڈسپلن بنا ہوا تھا۔ چوں کہ روحانیت کا تعلق آدمی کے احساسات اور جذبات سے ہے اور احساسات اور جذبات کا تعلق قلب سے۔ ایسی حالت میں یہ ایک فطری امر تھا کہ روحانیت کے حصول کے لئے قلب کو مرکز بنا کر محنتیں اور ریاضتیں کی جائیں۔ ذکر جہری جس میں مخصوص طریقہ سے لا الٰہ الا اللّٰہ بول کر قلب پر ضرب لگائی جاتی ہے، اسی تصور کی ایک مثال ہے۔ عرصہ سے میرا خیال تھا کہ روحانیت کے علم بردار حقیقی روحانیت کا تجربہ نہ کر سکے۔ تمام مسلم بزرگوں اور ہندو سوامیوں کی روحانی عظمت فرضی کرامتوں اور بناوٹی چمتکاروں پر قائم ہے نہ کہ ربانی معنوں میں حقیقی روحانیت پر۔

مگر اس کا اصل سبب کیا ہے، یہ مجھے پچھلے سالوں کے درمیان ہی سمجھ میں آیا۔ مابعد سائنسی دور میں پہلی بار انسان نے یہ دریافت کیا کہ قلب احساسات و جذبات کا مرکز نہیں، وہ صرف خون کی گردش (blood circulation) کا ایک آلہ ہے۔ اس نئی دریافت نے مجھ کو پہلی بار وہ فریم ورک دیا جس کی روشنی میں ہم روحانیت کے معاملہ کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ پہلے چوں کہ انسان کے پاس صحیح فریم ورک ہی موجود نہ تھا اس لئے وہ روحانیت کے معاملہ کو سمجھنے سے قاصر رہا۔

مابعد سائنسی دور میں پہلی بار انسان کو معلوم ہوا کہ تفکر اور احساس دونوں کا مرکز دماغ ہے۔ اس لئے روحانیت کے حصول کے لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ اس معاملہ میں اپنی کوشش کا مرکز دماغ کو بنائے نہ کہ قلب کو۔ کیوں کہ ہر قسم کے فکری اور حسیاتی عمل کا مرکز صرف دماغ ہے نہ کہ قلب۔ گویا کہ قلب پر دھیان لگانے والے لوگ وہاں روحانیت کی تلاش کر رہے تھے جہاں روحانیت سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ اس دریافت نے مجھے بتایا کہ روحانیت کے حقیقی حصول کے لئے مراقبہ اور

میڈیٹیشن (meditation) جیسی مشقیں اصل مقصد کی نسبت سے سراسر بے فائدہ اور غیر متعلق (irrelevant) ہیں۔ روحانی مقصد کے حصول کے لئے ساری اہمیت اس رخ پر ذہنی ارتقاء (intellectual development) کی ہے۔

اس دریافت سے مجھے معلوم ہوا کہ مسلم صوفیوں کا اپنے قلب پر ضربیں لگانا یا ہندو سوامیوں کا اپنے ذہنی عمل کو روک کر اپنے داخل میں دھیان لگانا، یہ سب سراسر غیر متعلق باتیں ہیں۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے ہاتھ پر توجہ ڈال کر اس پر ضرب لگائے یا اپنے پاؤں کو سامنے رکھ کر اس پر دھیان جمائے۔ پچھلے ہزاروں سال کے دوران لوگ اسی قسم کی غیر متعلق ورزشیں کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقی روحانیت سے آشنا نہ ہو سکے۔

سائنس نے ہم کو جو نعمتیں دی ہیں ان میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ اس نے روحانیت کے متلاشی لوگوں کے لئے صحیح روحانی مرکز کی نشان دہی کی۔ اس نے بتایا کہ دل کو مرکز بنا کر تم جو چیز حاصل کرنا چاہتے ہو وہ دراصل ذہن کو مرکز بنا کر حاصل ہوگی۔ انسان کا ذہن اپنے اندر بے شمار صلاحیتیں رکھتا ہے۔ انسان کے تمام افعال کا مصدر دماغ ہی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں روحانی مرتبہ کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ذہن کے روحانی گوشہ کو بیدار کیا جائے۔ ذہن میں فکری انقلاب لانا ہی روحانی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ روحانیت کی منزل تک پہنچنے کا راستہ دل سے ہو کر نہیں جاتا، بلکہ وہ دماغ کے راستہ سے ہو کر گزرتا ہے۔

یہ سائنسی حقیقت قرآن میں پہلے سے موجود ہے۔ چنانچہ قرآن میں روحانیت (ربانیت) کے حصول کے لئے جس چیز کو ذریعہ بتایا گیا ہے وہ تفکر اور تذکر اور توسم ہے۔ اس قسم کے الفاظ جو قرآن میں استعمال کئے گئے ہیں ان سب کا تعلق ذہنی بیداری سے ہے نہ کہ قلبی ورزش سے۔ غالباً اسی حقیقت کی طرف قرآن میں اولو الالباب (آل عمران ۷) کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں بار بار قلب کا لفظ استعمال ہوا ہے (البقرہ ۲۶۰) مگر یہ ادبی معنوں میں ہے نہ کہ علمی معنوں میں۔ مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فاعتبروا یا اولی الابصار

(الحشر ۲)اس آیت میں واضح ہے کہ عبرت پذیری کا مرکز آنکھ نہیں ہے بلکہ ذہن ہے۔آنکھ سے آدمی صرف دیکھتا ہے مگر دیکھی ہوئی چیز کو عبرت میں ڈھالنا تمام تر عقل کا کام ہے۔قرآن کی اس آیت میں بصارت کا لفظ ادبی معنوں میں ہے۔اسی طرح قلب کا لفظ بھی جہاں قرآن میں اس مفہوم میں آیا ہے وہ ادبی معنوں میں آیا ہے نہ کہ علمی معنوں میں۔

میں نے ۳رجون کی صبح کو بی بی سی لندن (BBC London) کا پروگرام (programme) سنا۔ اس کا ایک آئٹم یہ تھا کہ انھوں نے بتایا کہ لندن میں ایک آیورویدک یونیورسٹی (Ayurvedic University) بنائی جارہی ہے۔اس کے فاؤنڈر (founder) نے بتایا کہ اس یونیورسٹی کا ایک سبجکٹ آرٹ آف اسپریچول مینجمنٹ (art of spiritual management) ہوگا۔انھوں نے بتایا کہ مغربی ملکوں میں لوگوں نے ہر قسم کا مادی سامان حاصل کرلیا ہے۔ پہلے وہ سمجھتے تھے کہ مادی ترقی ان کو پوری خوشی دے گی۔مگر جب ساری مادی چیزیں مل گئیں تو انھیں محسوس ہوا کہ انھیں سچی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔اس لئے اب وہ کسی اور چیز کی تلاش میں ہیں۔آیورویدک یونیورسٹی ان کی اس تلاش کا جواب ہوگی۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک یہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ان لوگوں کا ماننا یہ ہے کہ روزمرہ کے کام میں انسان کا مائنڈ (mind) زہریلا (toxicated) ہوجاتا ہے، یعنی مائنڈ میں ایک قسم کا زہر بھر جاتا ہے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے مائنڈ کو ڈی ٹاکسیفائی (detoxify) کرنے کے لئے ایک ٹکنیک بنائی ہے۔اس ٹکنیک کے ذریعہ ذہن دوبارہ معتدل ہوجاتا ہے۔یہ ٹکنیک ایک خاص طریقہ پر سانس کو اندر لے جانے اور باہر نکالنے پر قائم ہے۔میں نے کہا کہ یہ ایک بالکل غیر متعلق بات ہے۔ ذہنی تناؤ ایک ایسا پرابلم ہے جو سوچ (thinking) سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ ایک خاص طریقہ سے سانس لینا اور نکالنا ایک جسمانی واقعہ ہے۔اور جسمانی تدبیر سے کبھی دماغ کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

سفر پر روانہ ہوتے ہوئے ہم نے آج (۳ جون ۲۰۰۴) کے اخبارات اپنے ساتھ رکھ لئے

تاکہ راستہ میں ان کا اجتماعی مطالعہ کیا جاسکے۔ وہ اخبارات یہ تھے — ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، پنجاب کیسری، راشٹریہ سہارا، ہند سماچار، اخبار مشرق، عوام۔

آج کے ٹائمس آف انڈیا میں حسب معمول جو قول نقل کیا گیا تھا وہ مسٹر جے این دکشت کا ایک قول تھا۔ انہوں نے انڈیا اور پاکستان کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں کہا کہ: اس سلسلہ میں جو چیز ضروری ہے وہ ہے بات چیت جاری رکھنے کا عزم پاکستان کے ساتھ اور ٹکراؤ کو اوائڈ (avoid) کرنے کی پالیسی اختیار کرنا:

What is needed in a determination to continue the dialogue (with Pakistan) and a policy to avoid confrontation.

یہ بات انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں کے ذمہ دار مختلف الفاظ میں کہتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت گزرنے کے بعد بھی دونوں کے درمیان معتدل تعلقات قائم نہیں ہوئے۔ اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ دونوں ملک اس مسئلہ کو دوطرفہ بنیاد (bilateral basis) پر حل کرنا چاہتے ہیں جب کہ تجربہ بتاتا ہے کہ نزاعی مسائل یا تو یک طرفہ بنیاد پر حل ہوتے ہیں، یا پھر کبھی حل نہیں ہوتے۔

ٹائمس آف انڈیا ۳ جون (صفحہ ۱۰) پر ایک دلچسپ تصویر تھی۔ یہ امریکا کے صدر جارج بش کے بارے میں تھی۔ اس میں ان کے ایک واقعہ کا ذکر تھا جس کو چار مختلف تصویروں میں نمایاں کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے یہ لکھا ہوا تھا:

President Bush is caught in a rain storm with a faulty umbrella while walking from Marino One to Air Force One at Andrews Air Force Base in Maryland on June 2.

یعنی صدر بش ایک طوفان میں پھنس گئے۔ وہ اس وقت ایک چھتری لئے ہوئے تھے۔ چھتری کو وہ مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہیں مگر وہ تیز ہوا میں الٹ گئی۔

صدر بش کے ساتھ عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی یہ گویا ایک تمثیل ہے۔ وہ سمجھتے تھے

BUSH AND THE UMBRELLA

AP

President Bush is caught in a rain storm with a faulty umbrella while walking from Marine One to Air Force One at Andrews Air Force Base in Maryland on Wednesday.

Reuters

AFP

AP

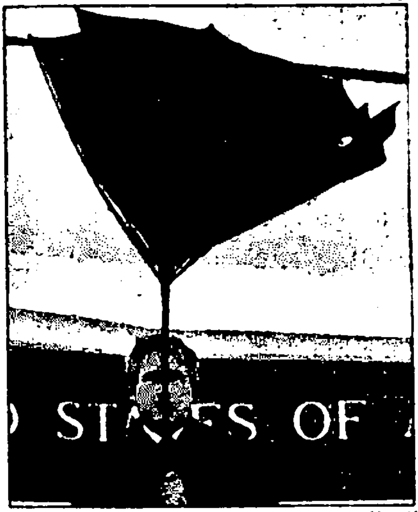

کہ عراق کا معاملہ مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں ہے مگر ان کی ساری کوشش، بے شمار جانی اور مالی قربانی کے باوجود یہ معاملہ ان کے ہاتھ سے اس طرح نکل گیا کہ انہیں ویتنام کی مانند عراق سے واپسی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ یہی معاملہ موجودہ دنیا میں ہر شخص کا ہے۔ آدمی جوش میں آکر ایک اقدام کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ حالات مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں رہیں گے مگر آخر کار حالات اس کے قبضہ سے نکل جاتے ہیں اور وہ اس فارسی شعر کی تصویر بن جاتا ہے کہ عقل مند آدمی ایسا کام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو:

کجا کارے کند عاقل — کہ باز آید پشیمانی

آج ۳ جون کی صبح کو حسب معمول میں نے بی بی سی لندن کا پروگرام سنا۔ اس میں صدر امریکا جارج بش کی ایک تقریر سنائی گئی۔ اس تقریر میں پریزیڈنٹ بش جوش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ ہم کو آزاد دنیا بنانا ہے اور ٹررزم کو ختم کرنا ہے مگر یہ کوئی آسان منصوبہ نہیں۔ ٹررزم کے خلاف ہماری لڑائی صدیوں تک جاسکتی ہے۔

یہ مایوسی کا کلمہ ہے۔ جب کوئی آدمی ایک بلند بانگ منصوبہ بنائے اور پھر وہ اس میں ناکام ہوجائے تو وہ اسی قسم کے الفاظ بولتا ہے۔ مثلاً نام نہاد اسلام پسند لیڈر جو مسلم ملکوں کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ خطہ اسلام کے لئے الاٹ ہو چکا ہے اور ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کر کے رہیں گے۔ پھر دھواں دار کوششوں کے باوجود جب ان کا منصوبہ ناکام ہوگیا تو اب وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کا قیام چند دن میں نہیں ہوسکتا، اس کے لئے صدیوں کی کوشش درکار ہے۔ کتنی مشابہت ہے غیر اسلام کے علم برداروں اور اسلام کے علم برداروں میں۔

ٹائمس آف انڈیا (۳ جون ۲۰۰۴) کے صفحہ اول پر ایک خبر ڈاکٹر جے ایس راجپوت کے بارے میں تھی۔ پچھلے سالوں میں وہ سیکولر لوگوں میں اور مسلمانوں میں کافی بدنام ہوئے تھے۔ ان کو پچھلی حکومت کے زمانہ میں این سی ای آر ٹی (NCERT) کا ڈائرکٹر بنایا گیا تھا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ وہ اسکول کی نصابی کتابوں کا بھگوا کرن کر رہے ہیں۔

He was blamed for saffronising school text books.

خبر میں بتایا گیا تھا کہ نئی گورنمنٹ کے آنے کے بعد انھوں نے پیشگی ریٹائرمنٹ لے لیا۔ حکومت ان کی جگہ دوسرا ڈائرکٹر تلاش کر رہی ہے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی ڈاکٹر راجپوت تھے جنھوں نے اپنے ادارہ (NCERT) میں ۲۱ رمئی ۲۰۰۳ کو خصوصی اہتمام کے ساتھ اسلام کے موضوع پر میرا ایک خطاب رکھا تھا۔ اس پروگرام میں این سی ای آرٹی کا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ اس میں ۹۹ فیصد تعداد تعلیم یافتہ ہندوؤں کی تھی۔ اس تقریر کے آخر میں ڈاکٹر راجپوت نے اپنے اختتامی خطاب میں میری تقریر کو کافی پسند کیا اور اسٹیج سے انھوں نے اعلان کیا کہ مولانا ہمیں اسلام کی مثبت تعلیمات پر ایک کتاب تیار کر کے دیں اس کو ہم سارے انڈیا میں پھیلائیں گے۔ میں نے احادیث کی بنیاد پر ۵۰ صفحہ کی ایک کتاب تیار کی۔ یہ وہی کتاب ہے جو ماہنامہ الرسالہ (اکتوبر ۲۰۰۳) میں خصوصی شمارہ کے طور پر چھپی ہے۔ ڈاکٹر راجپوت اس کو اپنے ادارہ کی طرف سے چھپوانا چاہتے تھے مگر شاید انھیں اس کا موقع نہیں ملا۔

ہر واقعہ میں قرآن کے مطابق، عسر کے ساتھ یُسر کا پہلو ہوتا ہے۔ ہر مائنس پائنٹ میں ایک پلس پائنٹ موجود رہتا ہے جیسا کہ مذکورہ واقعہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ جن لوگوں کا ذہن اسلام کی اس تعلیم سے بنے وہ کسی غیر مطلوب چیز کے پیش آنے پر نہیں گھبرائیں گے، وہ غیر موافق میں کوئی موافق پہلو تلاش کر لیں گے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا (۳ جون ۲۰۰۴) میں صفحہ ۳ پر ایک مضمون مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں چھپا ہوا تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا: مسلمانوں کو فراموش کرنے کی کوشش۔ اس مضمون کا ایک حصہ یہ تھا:

''نئے وزیر اعظم ہند نے اپنی اولین ترجیح کے طور پر اعلان کیا تھا کہ اب ۱۹۸۴ کے سکھ فسادات اور گجرات (کے مسلم کش فسادات) کا اعادہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس کے چند دنوں کے بعد وہ نکات سامنے آئے جن کی بنیاد پر مشترکہ پروگرام (CMP) کی تشکیل ہوئی تھی۔ ان نکات میں یہ نکتہ بہت اہم تھا کہ فساد زدگان کو یکساں معاوضہ دیا جانا چاہئے۔ یہ اس لئے اہم تھا کہ ۱۹۸۴ کے سکھ

مخالف فسادات میں مارے جانے والے اکثر افراد کے ورثاء کو ۱۰-۱۰ لاکھ روپئے کا معاوضہ مل چکا ہے۔ حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سکھوں کے معاملہ میں سپریم کورٹ کے پاس کردہ حکم کو ایک معیار تسلیم کرتے ہوئے دیگر فساد زدگان کو بھی یہی رقم ادا کریں۔ مگر افسوس ہے کہ سکھوں کے علاوہ آج تک کسی اور فساد زدہ طبقہ کو مذکورہ معاوضہ نہیں مل سکا ہے۔ مگر نئی حکومت کے مشترکہ پروگرام سے یہ نکتہ غائب ہے کہ تمام فساد زدگان کو معاوضہ کی یکساں رقم ادا کی جائے گی۔ موجودہ سیکولر حکومت بے گناہوں کے خون کی قیمت پر وجود میں آئی ہے۔ ایسی حالت میں حکومت کی یہ اولین ترجیح ہونی چاہئے کہ وہ فرقہ پرستوں کی گوشمالی کرے۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ فسادات میں جن طبقات پر بربادی آئی ہے ان کی بازآبادکاری کے اقدامات بھی کرے۔ جب دو فیصد سکھوں کے لئے انصاف کا بڑا بھاری عمل اختیار کیا جاسکتا ہے تو ۱۵ فیصد مسلمانوں کے لئے کیوں نہیں۔''

یہ بات شاعری کی اصطلاح میں صرف ایک مضمون بندی ہے۔ اس قسم کی بات کرنے والوں کو یہ جاننا چاہیے کہ سکھوں کو جو کچھ ملا وہ اس طرح نہیں ملا کہ انھوں نے اینٹی سکھ پارٹی کو ہراؤ اور پرو سکھ پارٹی کو جتاؤ، کی انتخابی پالیسی اختیار کی۔ سکھوں کو جو کچھ ملا ہے وہ ان کی اپنی داخلی طاقت کے زور پر ملا ہے۔ مسلمانوں کو بھی جو کچھ ملے گا وہ ان کی خود اپنی طاقت کے بل پر ملے گا۔ شکایت اور احتجاج اور مطالبہ سے اس دنیا میں کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔

ہندی روزنامہ پنجاب کیسری (۳ جون ۲۰۰۴) کے پہلے صفحہ پر ایک خبر چودھویں لوک سبھا میں حلف برداری کی رسم کے بارہ میں تھی۔ اس کا ایک جزء کانگریسی لیڈر اجیت جوگی کے بارہ میں تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

'' کانگریس کے ورشٹھ نیتا اجیت جوگی نے آج وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے لوک سبھا سدسیتا کی شپتھ لی۔ چھتیس گڑھ میں مہاسمند سے نرواچیت جوگی چناؤ پرچار کے دوران ایک سڑک دُرگھٹنا میں گمبھیر روپ سے گھائل ہوگئے تھے۔ جوگی سدن کے دروازے تک وہیل چیئر پر بیٹھ کر آئے اور انہوں نے دروازہ پر ہی وشیش مائک کی ویوستھا سے شپتھ لی۔ بعد میں سدسیوں کے رجسٹر پر بھی ان سے وہیں

جا کر ہستا کھر کرائے گئے۔ شپتھ لینے پر سدسیوں نے تالیاں بجا کر اور میزیں تھپتھپا کر ان کا سواگت کیا۔ کئی سدس ان کا ابھیوادن کرنے ان کے پاس گئے۔‘‘

مسٹر اجیت جوگی کے بارہ میں یہ خبر دیکھ کر مجھے کئی سال پہلے کا واقعہ یاد آیا جب کہ ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بھوپال کے ایرپورٹ پر ہوئی تھی۔ یہ واقعہ ماہنامہ الرسالہ میں چھپ چکا ہے۔

۳ جون کو نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ایک واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ ایک اردو اخبار میں اس عنوان کے ساتھ چھپا: لالو کے دورہ نے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کی تقدیر بدل دی۔ اس عنوان کے تحت اردو اخبار میں جو خبر چھپی تھی اس کو یہاں کسی تبدیلی کے بغیر نقل کیا جا رہا ہے:

’’ریلوے انکوائری کا نمبر ملانے پر فون نہ اٹھانے سے ناراض وزیر ریلوے لالو یادو خود ہی نئی دہلی ریلوے اسٹیشن میں واقع انکوائری آفس میں جا پہنچے۔ وہاں کا نظارہ دیکھ کر لالو دم بخوردہ رہ گئے۔ زیادہ تر ملازم اپنی سیٹوں پر نہیں تھے۔ پھر کیا تھا، انہوں نے اپنے ’مخصوص اسٹائل‘ میں افسروں کی ’کلاس‘ لی۔ آج اسٹیشن کا نظارہ ہی بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے کل رات تقریباً آٹھ بجے ریلوے انکوائری نمبر پر بات کرنی چاہی۔ گھنٹی بجتی رہی کسی نے ٹیلی فون نہیں اٹھایا۔ اس پر غصہ ہو کر وہ اسٹیشن چل پڑے۔ وہاں دیکھا کہ گھنٹیاں بج رہی ہیں اور کوئی ملازم نہیں ہے۔ انہوں نے خود کئی فون اٹینڈ کئے۔ اس کے بعد انکوائری کاونٹر پر گئے۔ وہاں مسافر تو تھے مگر کوئی ملازم نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ پلیٹ فارم نمبر ایک چار پانچ پر پہنچے۔ وہاں گندگی دیکھ کر بپھر پڑے۔ انہوں نے متعلقہ ملازمین کو لتاڑ پلائی اور کارروائی کرنے کی وارننگ دی۔ واپسی میں راستے میں موجود لیٹرین کی حالت دیکھ کر ان سے رہا نہیں گیا اور اس کے ملازمین کو خوب لتاڑا۔ پھر انہوں نے مسافروں سے بات چیت کی۔ ویٹنگ روم میں پنکھا نہ چلنے کی شکایت پر انہوں نے سخت رویہ اپنایا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ریلوے اسٹیشن کا معائنہ کرنے کے بعد لالو کا پارہ کافی چڑھ گیا تھا اور اس کا نزلہ اندر کمار نامی ملازم پر گرا۔ یہ وہی ملازم ہے جس کی ڈیوٹی انکوائری کاونٹر پر تھی اور جب وزیر موصوف وہاں پہنچے تو حضرت اپنی سیٹ سے غائب تھے۔

انہوں نے اندر کمار کو معطل کر دیا۔ اس کے علاوہ کال سینٹر پر کام کرنے والے ایک ملازم کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کا حکم دیا۔ لالو یادو پلیٹ فارم چار اور پانچ کے وینڈروں کے پاس بھی گئے اور اسٹال پر موجود کلہڑ اٹھا کر دیکھا اور اس کی سپلائی کے بارے میں جانکاری لی۔ ان کے دورے کا یہ جادوئی اثر ہوا کہ پلیٹ فارم چمکنے لگے۔ خراب پنکھے ٹھیک ہو گئے، انکوائری کاونٹروں پر ایک کے بجائے دو دو ملازم تعینات کر دیے گئے۔ گندگی کے نام پر کاغذ کا ایک ٹکڑا تک نظر نہ آیا۔ گندے پڑے پیشاب گھر کی شیٹیں بدل دی گئیں اور نالیوں میں ڈی ڈی ٹی کا پاؤڈر ڈال دیا گیا گویا مسافروں کو فیل گڈ ہو رہا ہے۔''

یہی اصلاح کا صحیح طریقہ ہے۔ منسٹر لوگ اگر سرپرائز وزٹ (surprise visit) کے اس طریقہ کو مستقل طور پر اپنالیں، بشرطیکہ وہ اس معاملہ میں سنجیدہ اور صاحب کردار ہوں، تو صرف ۵ سال کی مدت میں پورے ملک میں ایک نیا دور آ جائے گا۔ اس کے بعد شائننگ انڈیا صرف ایک نعرہ نہیں رہے گا بلکہ وہ ایک ایسا واقعہ بن جائے گا جس کو ہر آدمی دیکھے اور جس کو ہر آدمی محسوس کرے۔

ٹائمز آف انڈیا (۳ جون ۲۰۰۴) کے صفحہ تین پر ایک عبرت انگیز خبر تھی۔ پچھلے مہینہ سیکنڈری ایجوکیشن (CBSE) کے امتحان سے پہلے یہ خبر آئی تھی کہ اس کے پرچے پیشگی طور پر آؤٹ ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں پولیس نے متعلقہ دفتر میں کام کرنے والے ایک کمپیوٹر آپریٹر ہمنت شرما (Hemant Sharma) کو گرفتار کر لیا تھا۔ ہمنت شرما نے پولیس کے سامنے انکشاف کیا تھا کہ اس معاملہ میں اصل مجرم سدھیر سچدیو (Sudhir Sachdeva) ہے۔ ہمنت شرما کے بیان کے مطابق، سدھیر سچدیو نے سی بی ایس ای (CBSE) کے ملازم کو ۵۰ لاکھ روپئے دے کر یہ پرچہ پیشگی طور پر حاصل کئے تھے تا کہ طالب علموں میں اس کو بیچ کر نفع کمائے۔

پچھلے ایک مہینہ سے پولیس کو سدھیر سچدیو کی تلاش تھی۔ مگر پولیس اب تک اس کو پکڑ نہ پائی تھی۔ کل اچانک وہ خود سے دہلی کی عدالت میں حاضر ہو گیا۔ مگر پولیس اس کو گرفتار نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ اس کے پاس پیشگی ضمانت کا عدالتی آرڈر موجود تھا:

Sachdeva was armed with an anticipatory

bail order from the Cuttack High Court.

موجودہ قانونی نظام میں جو خامیاں ہیں، مذکورہ واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔ آج کل ہر دن کثرت سے جرائم ہورہے ہیں۔ عدالتوں میں لاکھوں کی تعداد میں مقدمات موجود ہیں مگر قوانین کی کثرت کے باوجود جرائم میں کمی نہیں ہوتی۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ ان قوانین میں اتنی لچک موجود ہے کہ ہر مجرم کسی نہ کسی طرح سزا سے بچ جاتا ہے۔ قوانین کی ان کمزوریوں نے ایک لوپ ہول انڈسٹری (loop whole industry) قائم کر رکھی ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ مجرم کی جیب میں کافی پیسہ ہو جس سے وہ ایک قانونی دماغ (وکیل) کو خرید سکے۔ جس آدمی کے اندر یہ قوت خرید موجود ہو اس کو قانونی سزا سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہندستان ٹائمس (۳ جون ۲۰۰۴) میں ایک دلچسپ خبر تھی۔ یہ طلاق کی خبر تھی۔ اس خبر کا عنوان یہ تھا — ٹیلی فونی طلاق:

phoney divorce

خبر میں بتایا گیا تھا کہ اردن کے ایک شخص ابو سمیع نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا۔ شریعت کے ضابطہ کے مطابق، اس نے اس طلاق کو تین مہینہ میں پورا کیا۔ اس طلاق کی وجہ ابو سمیع نے یہ بتائی کہ میری بیوی انٹرنیشنل ٹیلی فون پر گھنٹوں بات کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس کے ٹیلی فون کا بل اس کی تنخواہ کی رقم سے تین گنا زیادہ ہو جاتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

مذکورہ خاتون کی یہ عادت ناقابلِ فہم حد تک عجیب ہے۔ اس کے اندر یہ عادت کیوں پڑی، اس پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آتا ہے کہ غالباً اس کی ابتدائی پرورش جس گھر میں ہوئی وہاں اس کے ماں باپ اور اس کے گھر والے اس کے ساتھ بہت زیادہ لاڈ پیار کا سلوک کرتے تھے۔ اس کے بعد جب اس کی شادی ہوئی اور وہ اپنے شوہر کے گھر آئی تو غالباً اس کے شوہر نے بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا لاڈ پیار اور ناز برداری کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں خاتون کا مزاج بگڑ گیا۔ لاڈ پیار یا ناز برداری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسی خاتون اپنے آپ میں جینے لگتی ہے۔ غیر شعوری طور پر

وہ سمجھ لیتی ہے کہ میں جو کچھ کروں سب درست ہے، میرا کوئی کام غلط نہیں۔ مذکورہ خاتون کا کیس غالباً اسی قسم کا ایک کیس تھا۔

کامیاب شادی شدہ زندگی دو انسانوں کے درمیان ایڈجسٹمنٹ کا نام ہے۔ ایڈجسٹمنٹ کا یہ مزاج دونوں کے اندر ہونا چاہئے۔ یہ ایڈجسٹمنٹ دونوں کے تعلقات میں توازن قائم رکھتا ہے۔ جہاں ایڈجسٹمنٹ نہ ہو وہاں توازن ٹوٹ جائے گا جو آخر کار تعلقات کے بگاڑ اور طلاق پر ختم ہوگا۔

ایک اردو اخبار میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک اقتباس شائع کیا گیا تھا۔ اس اقتباس کا عنوان یہ تھا: سیرت محمدی کا تکمیلی پہلو۔ اس عنوان کے تحت جو اقتباس درج تھا اس کی چند سطریں یہ تھیں:

''کوئی زندگی خواہ کسی قدر تاریخی ہو جب تک وہ کامل نہ ہو ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی۔ کسی زندگی کا کامل اور ہر نقص سے بری ہونا، اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زندگی کے تمام اجزاء ہمارے سامنے نہ ہوں۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کا ہر لحہ پیدائش سے لے کر وفات تک آپ کے زمانہ کے لوگوں کے سامنے اور آپ کی وفات کے بعد تاریخِ عالم کے سامنے ہے۔ آپ کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں گذرا جب وہ اپنے اہل وطن کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر آئندہ کی تیاری میں مصروف ہوں۔''

اس اقتباس کے مطابق، اُسوہ (نمونہ) وہی بن سکتا ہے جو کامل ہو۔ مذکورہ اقتباس میں آگے جو تفصیل بتائی گئی ہے اس کے مطابق، صرف پیغمبر اسلام کو یہ کامل حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے صرف وہی اُسوہ بن سکتے ہیں۔ یہ بات قرآن کے مطابق نہیں۔ اس لیے کہ قرآن کی سورہ نمبر ۶۰ میں ارشاد ہوا ہے: قد كانت لكم أسوة حسنة في ابراهيم والذين معه (الممتحنہ ۴)۔ یعنی تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے ابراہیم میں اور ان کے ساتھیوں میں۔ مصنف کے معیار کے مطابق، حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھی تاریخی اعتبار سے کامل نہیں۔ ایسی حالت میں قرآن کا انہیں اسوہ (نمونہ) کے طور پر پیش کرنا مصنف کے نظریہ کی واضح تردید ہے۔

اصل یہ ہے کہ استدلال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شاعرانہ استدلال اور دوسرے علمی

استدلال۔ شاعرانہ استدلال یہ ہے کہ آدمی اپنے ذاتی خیال کے مطابق، استدلال قائم کرے، خواہ اس کا یہ خیال خارجی حقائق سے مطابقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اس کے مقابلہ میں علمی استدلال یہ ہے کہ جو اسٹیٹمنٹ دیا جائے، تمام متعلقہ حقائق سے اس کی تصدیق (corroboration) مل رہی ہو۔ اس تقسیم کے مطابق، مذکورہ اقتباس شاعرانہ استدلال کی مثال ہے، نہ کہ علمی استدلال کی مثال۔

ایک اخبار میں ایک مضمون امریکی صحافی سموئیل ہنٹنگٹن کی مشہور کتاب تہذیبوں کا تصادم کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہنٹنگٹن کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ سوویت روس کے ٹوٹنے کے بعد اب آئندہ اگر کسی تصادم کا اندیشہ ہے تو وہ ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ یہ ٹکراؤ تہذیبوں کے درمیان ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ کنفیوشس کے اقدار پر مبنی تہذیب، یا ہندو تہذیب مغربی یعنی یورپی امریکن تہذیب کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ مغربی تہذیب کو واقعتاً صرف اسلام سے خطرہ لاحق ہے۔

صاحب مضمون نے ہنٹنگٹن کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کیا تھا۔ مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ اس قسم کی رائے رکھنے والوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کو دو مقابل اور متحارب یونٹ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ تصور سراسر بے بنیاد ہے۔ اسلام کا تعارف قرآن میں دوسری قوموں کے مد مقابل کی حیثیت سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ اسلام تمام انسانیت کا خود اپنا مطلوب دین ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے، اس لیے تمام انسانوں کا دین ہے۔ وہ تمام انسانوں کے دل کی آواز ہے۔ اس لیے اسلام کا مقصد دوسروں سے تصادم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اسلام اور انسانیت کے درمیان مشترک بنیاد (common ground) کو دریافت کر کے انہیں اپنے قریب لائے۔ اسلام تمام انسانوں کو ایک خدا کی عبادت کا پیغام دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ: تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللّٰہ۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے مادی اور قومی مسائل کو اسلام کا نام دے کر دوسری قوموں سے لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ اس سے لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اسلام دوسری قوموں کے ساتھ تصادم کی حالت میں ہے۔ حالاں کہ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ اگر کوئی تصادم ہے تو وہ مسلم

قوموں اور دوسری قوموں کے درمیان ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام کا کوئی تصادم کسی فرد یا قوم سے نہیں۔

ہندی روزنامہ دینک جاگرن (۳ جون ۲۰۰۴) میں ایک خبر چھپی ہوئی تھی۔ اس خبر کا عنوان یہ تھا: راشٹرپتی کی یاترا سے سُرخیوں میں آیا سرگی پال۔ اس خبر کا ابتدائی حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

بَستر ضلع کا لگ بھگ چودہ سو کی جن سنکھیا والا آدیواسی بہول گاؤں ران سرگی پال اچانک سرخیوں میں ہے۔ اور پرشاسنک ادھیکاری گاؤں کی اور دوڑے چلے جارہے ہیں، سڑکیں بن رہی ہیں۔ بجلی کی ویوستھا کی جارہی ہے۔ گرمیوں کی چھٹی کے باوجود شِکھک گاؤں میں بچوں کو پڑھانے آرہے ہیں۔ ران سرگی پال کے ادھیکانش لوگوں کو بدلی ہوئی ویوستھا سے سکھد آشچر ی ہورہا ہے۔ دراصل ۴ جون کو اس گاؤں میں راشٹرپتی اے پی جے عبد الکلام کا دورہ پرستاوِت ہے۔ لیکن گاؤں کے ادھیکانش آدی واسی ابھی بھی بدلاؤ کے اس واستوِک کارڑ سے اَن بھگ ہیں۔ ضلع مکھیالے جگدل پور سے لگ بھگ ۲۵ کیلومیٹر دور گرام ران سرگی پال کے سات محلے ہیں۔ پیڈے پارا، ڈینگری گڑا پارا، لانڈا گڑا پارا، بڈے پارا، ساڈرگڈا، نوگڈا، وابیڈا گڑا۔ ان ساتوں محلوں کو ویواستھت کیا جارہا ہے۔ بَستر کی صاف ستھری یعنی خوش حال بستر کی تصویر ان محلوں کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

یہ ہندستانی جمہوریت کی ایک تصویر ہے۔ یہاں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی بڑا حکومتی عہدہ دار کسی مقام کا سفر کرتا ہے تو وقتی طور پر وہاں صفائی اور چوکسی کا مظاہرہ کیا جانے لگتا ہے۔ حالاں کہ اصل جمہوریت یہ ہے کہ صفائی اور چوکسی جیسی چیزوں کا اہتمام ملک کے عوام کے لیے کیا جائے۔ کیوں کہ جمہوری اصول کے مطابق، ملک کے اصل حاکم اس کے عوام ہیں، نہ کہ سیاسی عہدہ دار۔

بلسوری گاؤں میں تقریباً پانچ ہزار لوگ رہتے ہیں۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے لوگ ہیں، مگر یہاں نہ کوئی مندر ہے اور نہ کوئی مسجد۔ مسٹر کرپال سنگھ کے الفاظ میں ’’اس لئے یہاں مندر اور مسجد کا کوئی جھگڑا نہیں‘‘۔ گاؤں کے ہر گھر میں بجلی ہے اور تقریباً تین سو گھروں میں ٹیلی فون لگے

ہوئے ہیں۔ یہاں زیادہ تر کسان لوگ رہتے ہیں اور ہر ایک کے پاس اس کی اپنی زمین ہے جس میں وہ کھیتی کرتا ہے۔ گاؤں میں سو سے زیادہ ٹریکٹر ہیں۔ یہاں مجھے بتایا گیا کہ یہاں کا ہر بچہ پڑھ رہا ہے۔ گاؤں میں اسکول بھی ہے اور کالج بھی۔ یہاں کوئی بے پڑھا لکھا آدمی دکھائی نہیں دے گا۔ یہاں پانی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ گنگا نہر گاؤں کے پاس سے گزرتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ٹیوب ول لگے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر فرقہ کے لوگ رہتے ہیں مگر مجھے بتایا گیا کہ یہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔

بلسوری گاؤں میں میرے آنے کا مقصد یہ تھا کہ میں مسٹر کرپال سنگھ کی لڑکی نیتو رانی کی شادی کی تقریب میں شرکت کروں۔ اس سلسلہ میں ان کے گھر کے لوگوں اور گاؤں کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ گاؤں کے سرپنچ مسٹر روندر کمار سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہاں کے سب لوگ مجھے بہت سادہ اور صحیح مزاج کے دکھائی دئے۔ مجھے ایسا لگا کہ یہاں کے لوگ اپنے اپنے نیچر پر ہیں۔ ان میں وہ بگاڑ نہیں آیا ہے جو شہروں میں دکھائی دیتا ہے۔

نیتو رانی (۲۲ سال) کی شادی آج رات کو ہو رہی ہے۔ ان کا ہونے والا شوہر ایک پولس انسپکٹر ہے جو گوالیار میں رہتا ہے۔ میں نے نیتو رانی سے کہا کہ میں آپ کو کامیاب جیون کا ایک بہت سادہ فارمولا (formula) بتاتا ہوں۔ یہ فارمولا مجھے ایک صاحب سے ملا۔ ان کو میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوش رہتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی زندگی میں وہ سارے پرابلم آتے ہیں جو دوسروں کی زندگی میں آتے ہیں۔ انھوں نے ہر بات کا ایک سادہ حل یہ بنایا ہے ''چلو یہ بھی ٹھیک ہے''۔ جب بھی کوئی بات پیش آتی ہے یا کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو ان کو اچھی نہ لگے تو وہ اس سے الجھتے نہیں ہیں بلکہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں نے کہا کہ ہر ٹنشن کو دماغ سے نکالنے کا یہ سب سے اچھا فارمولا ہے۔ آپ ٹینشن کو ٹینشن کے روپ میں نہ لیجئے بلکہ یہ کہہ دیجئے کہ چلو یہ بھی ٹھیک ہے، اور پھر اس طرح رہئے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔

بلسوری میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام امت ملک ہے۔ وہ کمپیوٹر کا کورس کر رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سفارش کے ذریعہ کوئی سروس حاصل کریں۔ میں نے ان کو نصیحت

کرتے ہوئے کہا کہ سفارش سے آپ کو جو چیز ملے گی وہ صرف کوئی چھوٹا جاب(job) ہوگا، بڑی ترقی نہیں۔ آپ نے کمپیوٹر کی لائن پکڑی ہے۔ اس میں آپ خوب محنت کیجئے اور اچھے ایکسپرٹ(expert) بن جائیے، پھر ترقی ہی ترقی ہے۔ مشہور مثل ہے کہ ٹاپ کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے:

There is always room at the top

ہماری گاڑی کے جو ڈرائیور تھے ان کا نام منجیت سنگھ تھا۔ سردار منجیت سنگھ سے ہم نے پوچھا کہ آپ بہت دن سے گاڑی چلا رہے ہیں۔ یہ بتائیے کہ روڈ ایکسیڈنٹ(road accident) سے بچنے کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ ایکسیڈنٹ اس لئے ہوتے ہیں کہ گاڑی چلانے والے نشہ کی حالت میں گاڑی چلاتے ہیں۔ اس لئے ڈرائیور کو چاہئے کہ وہ شراب پی کر گاڑی نہ چلائے۔

۳ جون کی شام کو مسٹر کرپال سنگھ کے خاندان اور رشتہ کی عورتیں ان کے گھر پر اکھٹا ہو گئیں۔ یہ عورتیں چاہتی تھیں کہ میں ان کے بیٹے اور شوہر کے لئے کوئی دعا بتاؤں۔ میں نے ان کو دعا بتائی۔ ایک خاتون نے کہا کہ ان کا شوہر بہت زیادہ غصہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ جب بھی انھیں غصہ آئے تو آپ بالکل چپ ہو جائیے اور دل ہی دل میں یہ دعا پڑھیے:

رب انی مغلوب فانتصر

ایک اور خاتون نے کہا کہ میرے بیٹے کے لئے کوئی دعا بتائیے کہ اس کو اچھا جاب(job) مل جائے۔ میں نے ان کو یہ دعا لکھ کر دی:

رب افتح لی أبواب رحمتك

میں نے کہا کہ آپ روزانہ دو وقت اس دعا کو پڑھیں، رات کو سونے سے پہلے ہاتھ منھ دھو کر اس دعا کو دس بار دہرائیں اور پھر چپ چاپ سو جائیں اور پھر جب صبح کو اٹھیں تو دوبارہ ہاتھ منھ دھوئیں اور اس دعا کو دس بار پڑھیں۔

بلسوری میں بہت سے ہندوؤں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان سب لوگوں سے روحانیت کے انداز میں اسلام پر گفتگو ہوئی۔ ہر ایک کا ردعمل مثبت اور تعمیری تھا۔ سب

نے اصرار کیا کہ آپ دوبارہ ہمارے یہاں آیئے اور زیادہ دیر تک یہاں قیام کیجئے۔ ہم لوگ آپ کا آشیرواد لینا چاہتے ہیں اور آپ سے بہت کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔

تین جون کی شام کو بلسوری سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ ہماری گاڑی بظاہر ایک جغرافی سفر طے کر رہی تھی مگر اللہ کی مدد نے اس کو ایک روحانی اور تربیتی سفر بنا دیا۔ اس سفری کلاس میں اس کا ہر ممبر یکساں طور پر شریک تھا۔ یہ ایک انوکھی کلاس تھی جس کا ہر فرد بیک وقت معلم بھی تھا اور متعلم بھی۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آپ میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی سوال پوچھے۔ پھر میں نے کہا کہ سوال کیا ہے۔ سوال دراصل مطالعہ اور غور وفکر کی ایک اعلیٰ صورت ہے۔ سوال کوئی سادہ چیز نہیں۔ سوال آدمی کی پوری شخصیت کا ایک تعارف ہے۔ سوال اپنی حقیقت کے اعتبار سے جواب کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ جب آپ کا ذہن ایک مسئلہ سے دوچار ہو تو وہ اپنے آپ ایک سوال پیدا کرتا ہے۔ پھر غور وفکر کے ذریعہ وہ اس کے جواب تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب بھی کوئی آدمی سچا متلاشی (seeker) ہوگا تو ضرور اس کے ذہن میں سوالات آئیں گے۔ سوالات سے خالی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کا ذہن غور وفکر سے خالی ہے۔ آدمی کو کبھی سوال کرنے سے ہچکچانا نہیں چاہئے۔ اسی کے ساتھ آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ صحیح جواب آنے کے بعد وہ اس کو مان لے اور اس کو اپنے ذہن کا جزء بنائے۔

ڈاکٹر محمد اقبال پردھان نے کہا کہ میرا سوال یہ ہے کہ بڑے شہروں سے پولیوشن (pollution) کیسے ختم کیا جائے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم کو دو میں سے ایک طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ یا تو ہم یہ کریں کہ ماقبل کار زمانہ (pre-car period) کی طرف لوٹ جائیں اور ہم سب لوگ پیدل چلنا شروع کر دیں۔ دوسرا طریقہ وہی ہے جو مغربی ملکوں میں اپنایا گیا ہے، یعنی کار پر کنٹرول کرنا۔ صرف اسی کار کو سڑک پر چلنے کی اجازت دینا جو مضر گیس (harmful gas) نہ نکالتی ہو۔

میں نے کہا کہ پولیوشن کا معاملہ یہ ہے کہ پٹرول (petrol) کا ایندھن جب کار میں جلتا ہے تو

وہ کاربن مونو آکسائڈ (carbon monooxide) نکالتا ہے جو انسانی ہیلتھ (health) کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کے حل کے لئے ایک ڈوائس (device) بنائی گئی ہے۔ وہ یہ کرتی ہے کہ کار کے انجن سے نکلی ہوئی کاربن مونو آکسائڈ گیس (carobon monooxide gas) کو کاربن ڈائی آکسائڈ (carbon dioxide) گیس میں کنورٹ (convert) کر دیتی ہے جو کہ ہیلتھ کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ تمام ترقی یافتہ ملکوں میں یہ طریقہ اپنایا گیا ہے۔ یہی آزمودہ طریقہ ہمیں بھی اپنے ملک میں اختیار کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں اور کوئی طریقہ موجودہ حالات میں ممکن نہیں۔

محمد خالد انصاری نے کہا کہ میرا سوال یہ ہے کہ خدا کی معرفت (realisation) کو کیسے بڑھائیں، خاص طور پر جب ہم سفر کر رہے ہوں۔ میں نے کہا کہ خدا کی معرفت بڑھانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ وہی ہے جس کو قرآن میں توسم کہا گیا ہے۔ آدمی ہر وقت کسی نہ کسی تجربہ سے گذرتا ہے۔ اس تجربہ سے کوئی خدائی پہلو نکالنا یہی معرفت کو بڑھانا ہے۔ آپ کو یہ کرنا ہے کہ آپ اپنے ہر تجربہ سے معرفت کی خوراک لیتے رہیں۔

مثلاً اس وقت ہم کار کے ذریعہ ایک سفر طے کر رہے ہیں، دہلی سے بلند شہر کا سفر۔ اس سفر کے دوران ہم کو ایک اور سفر کی یاد آنی چاہئے، یعنی دنیا سے آخرت کا سفر۔ جب ہم اس طرح سوچیں گے تو راستہ کا ہر واقعہ ہمارے لئے خدا کی یاد دلانے والا بن جائے گا۔ ہر واقعہ میں ہم کو خدا کی ربانی غذا ملتی رہے گی۔

پریا ملک نے کہا کہ میرا سوال یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی میں کرائسس (crisis) پر کیسے قابو پائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کرائسس مینجمنٹ (crisis management) کا طریقہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ کرائسس کوئی باہر کا پرابلم (problem) نہیں ہے بلکہ وہ خود آدمی کے اندر کا پرابلم ہے اور یہ پرابلم ہمیشہ معاملہ کے اصل نیچر (nature) کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کرائسس کا سبب یہ ہے کہ زندگی میں اکثر غیر متوقع صورت حال (unexpected situation) پیش آتی ہے۔ اس اچانک تجربہ پر آدمی گھبرا اٹھتا ہے۔ اگر وہ پہلے

سے جانتا کہ ایسا ہونے والا ہے تو وہ اس کو کرائسس کے روپ میں نہ لیتا بلکہ وہ ایسا پیش آنے پر کہتا کہ یہ تو وہی ہے جو ہونے والا تھا، پھر اس پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

وہ چیز جس کو کرائسس مینجمنٹ (crisis management) کہا جاتا ہے وہ دراصل خود اپنی سوچ کی مینجمنٹ (thought management) کا دوسرا نام ہے۔ اپنی سوچ کو مینیج (manage) کیجئے اور پھر آپ کبھی کرائسس کے مسئلہ سے دوچار نہیں ہوں گے۔

فریدہ خانم نے کہا کہ میرا سوال یہ ہے کہ اپنی ایگو (ego) کو کیسے ختم کیا جائے۔ (How to annihilate one's ego) میں نے کہا کہ ایگو (ego) وہی چیز ہے جس کو اردو میں انا کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کو نفس امارہ بتایا گیا ہے۔ قرآن میں پیغمبر یوسف کا ایک قول نقل کیا گیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتا (یوسف ۵۳)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایگو یا انا ہر آدمی کی ذات کا ایک پیدائشی حصہ ہے۔ کوئی آدمی بغیر انا کے اس دنیا میں نہیں ہوسکتا۔ آدمی کا کمال یہ نہیں کہ وہ بے انا ہو۔ آدمی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عملی طور پر انا کا شکار نہ ہونے دے۔ وہ انا کے ہوتے ہوئے بے انا بن جائے۔

منجو ورمانی نے کہا کہ میرا سوال یہ ہے کہ بنا کسی ڈسٹریکشن (distraction) کے ایک کام میں کیسے دھیان لگائیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ ایک ایسی دنیا چاہتے ہیں جہاں آپ کو کوئی ڈسٹریکشن کبھی نہ ہو تو آپ کسی سنسان آئلینڈ (Island) میں چلے جایئے مگر یاد رکھئے کہ وہاں بھی آپ کے لئے ایک پرابلم موجود ہے۔ وہ یہ کہ وہاں کوئی سوسائٹی (society) نہیں اور سوسائٹی کے بغیر جینا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے جتنا کی ٹنشن (tension) کے ساتھ جینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس دنیا میں آپ ہیں وہاں آپ کو ہر حال میں پرابلم کے بیچ میں رہنا ہے۔ اس لئے یہاں یہ سوچنا چھوڑ دیجئے کہ آپ کو پرابلم فری لائف (problem free life) مل جائے گی بلکہ آپ کو پرابلم کے ساتھ جینے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ یعنی آپ کو وہ چیز سیکھنی چاہئے جس کو میں ان الفاظ میں کہتا ہوں:

Art of problem management

پھر میں نے کہا کہ ڈسٹریکشن کوئی برائی (evil) نہیں وہ ایک نئی اپارچونیٹی (opportunity) ہے۔ جب آپ ڈسٹریکشن کا سامنا کرتے ہوئے پھر سے اپنے آپ کو اپنی لائن پر لے آتے ہیں تو یہ آپ کے لئے ذہنی ترقی (intellectual development) کا ایک موقع بن جاتا ہے۔

رجت ملہوترا نے کہا کہ انڈیا کا سب سے بڑا پرابلم کرپشن (corruption) ہے۔ یہ سب لوگ مانتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کرپشن کیسے ختم کیا جائے۔ میں نے کہا کہ اس سوال کے لئے میرا جواب وہی ہے جو مسٹر ارون شوری کا جواب ہے۔ ایک بار میں ارون شوری کے ساتھ سفر میں تھا۔ ایرپورٹ پر ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے میرا بیگ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہم لوگ آگے بڑھے تو بات چیت کرتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ انڈیا میں کرپشن بہت زیادہ ہے، بہت سے اینٹی کرپشن قانون بنائے گئے مگر اب تک کرپشن باقی ہے۔ کرپشن کو ختم کیے بغیر کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ پھر اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ مسٹر ارون شوری نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس کا حل تو وہی ہے جو اسلام میں بتایا گیا ہے۔ یعنی کڑی سزا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں سماجی جرائم کے لئے ڈیٹیرنٹ پنشمنٹ (deterrent punishment) کا اصول رکھا گیا ہے۔ یہی اس پرابلم کا حل ہے۔ انسان کے دل میں جب تک ڈر نہیں آتا وہ برائی کو نہیں چھوڑتا۔

استتھی ملہوترا نے سوال کیا کہ آفس میں کنفرنٹیشن (confrontation) سے کیسے بچا جائے۔ میں نے کہا کہ کنفرنٹیشن سے بچنے کا ایک ہی فارمولا (formula) ہے اور وہ یہ ہے کہ کنفرنٹیشن نہ کیا جائے۔ یعنی یک طرفہ طور پر اوائڈنس (avoidance) کے پرنسپل (principle) پر عمل کرنا۔ اس پرنسپل کو اس طرح بتایا گیا ہے:

Boss is always right

میں نے کہا کہ جو عورت یا مرد سروس کریں انھیں جاننا چاہئے کہ سروس میں آپ کے لئے دو میں سے ایک کا آپشن (option) ہے، یا یونی لیٹرل ایڈجسٹمنٹ (unilateral adjustment) یا استعفیٰ۔ تیسرا کوئی آپشن (option) نہیں۔ لوگ چوں کہ تیسرا آپشن ڈھونڈتے ہیں اس لئے وہ اس

طرح کا سوال کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس معاملہ میں کوئی تیسرا آپشن سرے سے موجود ہی نہیں۔

میں نے کہا کہ میں دہلی میں کاؤنسلنگ (counselling) کرتا ہوں۔ میرے پاس اکثر ملازمت پیشہ لوگ آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آفس کے غلط رویے کی شکایت کرتے ہیں۔ میں ان سے ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ آپ برداشت اور ٹالرینس کے اصول کو اپنائیے اور پھر آپ کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔

مثلاً ایک بار میرے پاس ایک ہندو خاتون آئیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ایک ٹیلی فون کرنا تھا۔ میں نے ٹیلی فون آپریٹر کو فون نمبر دیا اور کہا کہ اس کو ملا دو۔ لڑکی نے نمبر ملانے میں دیر کی۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ میں نے کہا کہ تم نے نمبر ملانے میں دیر کیوں کی۔ اس نے سخت لہجہ میں جواب دیا۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اس کو ہاتھ سے مار دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بعد باس نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ اس نے کہا کہ یہ دفتر کے آداب کے خلاف ہے کہ کوئی کسی کو مارے۔ اس لئے تم لڑکی سے معافی مانگو۔ مگر میری غیرت معافی مانگنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے اور وہ اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ آپ دفتر میں جا کر ساری (sorry) کہہ دیجئے اور صرف ایک لفظ کہنے سے سارا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ مگر اس خاتون نے میرا مشورہ نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو سروس سے نکال دیا گیا۔ اب وہ دوسری کمپنی میں سروس کر رہی ہیں۔ پہلے تجربہ کے بعد اب وہ اپنے الفاظ میں "بزدل" بن کر رہ رہی ہیں۔

میں نے کہا کہ غیر حقیقت پسندانہ روش کی قیمت ہمیشہ بزدلی اور منافقت کی صورت میں دینی پڑتی ہے۔ آپ اگر حقیقت پسندی کا اصول اختیار کرتیں تو آپ جس طرح دوسرے آفس میں رہ رہی ہیں اسی طرح آپ پہلے آفس میں بھی رہتیں۔ ایسی صورت میں آپ کا کیس بااصول خاتون کا کیس ہوتا، جب کہ اب آپ کا کیس دوعملی (duplicity) کا کیس بن گیا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ بعض مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ "قرآن کے کتاب لاریب ہونے کا دعویٰ قابل قبول نہیں۔ قرآن میں عوامی قانون سے متعلق صرف ۸۰ آیات ہیں، بقیہ چھ ہزار سے

زیادہ آیتوں پر مبنی قرآن بیشتر ساتویں صدی عیسوی کی شاعرانہ عربی سے عبارت ہے۔''

یہ تبصرہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں قانونی احکام والی آیتیں نسبتاً بہت کم ہیں۔ مگر یہ کہنا غلط ہے کہ بقیہ کئی ہزار آیتیں شاعری کی قسم کی چیز ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ آیتیں قرآن کے تصورات ونظریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان آیتوں کا مقصد یہ ہے کہ طاقتور اُسلوب میں قرآنی آئیڈیالوجی کو بتایا جائے جس کو قرآن میں قولاً بلیغاً في انفسهم کہا گیا ہے۔ یعنی وہ اُسلوب جو دماغ کو جگائے اور لوگوں کے اندر فکری انقلاب برپا کرے۔

ونود کمار پاوڈیا (ٹرافک کنٹرول، دہلی) سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ دہلی میں گاڑیاں بڑھتی جارہی ہیں اور پارکنگ (parking) کا پرابلم بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری سمجھ سے اصل بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں پبلک ٹرانسپورٹ (public transport) کا سسٹم (system) اچھا نہیں ہے۔ اس لئے لوگ زیادہ کاریں خرید رہے ہیں۔ اگر لوگوں کو یہ پتہ ہو کہ جب وہ گھر سے نکلیں گے تو بہت آسانی سے ان کو سڑک پر ایک اچھی بس مل جائے گی جو ٹائم پر انھیں وہاں پہنچادے گی جہاں انھیں جانا ہے۔ جہاں اس طرح کا قابلِ اعتماد پبلک ٹرانسپورٹ موجود ہو تو لوگ بسوں سے جانا پسند کریں گے اور کاریں خریدنے کا رجحان کم ہوجائے گا۔

شام کو ہماری ٹیم بلسوری سے واپس روانہ ہوئی۔ روڈ سے سفر کرتے ہوئے ہم لوگ شام کو پانچ بجے دہلی واپس آئے۔

سفر کے آخر میں ایک ساتھی سے میں نے پوچھا کہ اس پورے پروگرام کے بارے میں اپنا تأثر (impression) بتایئے۔ انھوں نے کہا کہ بہت اچھا لگا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ مگر میرے دماغ کی ساری کھڑکیاں نہیں کھلیں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میرے گھر میں میری بیوی، بچے اور میری ماں ہیں۔ گھر کی ذمہ داریوں کو مجھے سنبھالنا ہے۔ ایسی حالت میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ساتھ میں اپنی دینی ذمہ داریوں کو کس طرح ادا کروں۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی عذر (excuse) نہیں

ہے۔ پھر میں نے انھیں ایک قصہ بتایا۔ میں نے کہا کہ میں یوروپ کے ایک شہر میں گیا۔ وہاں میرے جاننے والے ایک عرب نوجوان رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کی یونیورسٹی میں میں نے ڈاکٹریٹ کے لئے اپنا نام رجسٹر کرایا تھا مگر اب میں نے ریسرچ کا کام چھوڑ دیا ہے۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ میری بیوی ایک عرب خاتون ہیں۔ وہ انگلش نہیں جانتی اس لئے شاپنگ وغیرہ کا سارا کام مجھے کرنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی عذر نہیں۔ پھر میں نے ان کو ایک فارمولا بتایا۔ وہ فارمولا یہ تھا:

Not to solve the problem is also a way of solving the problem

میں نے کہا کہ جب آدمی یہ محسوس کرے کہ میرے پاس کوئی ہیلپر (helper) نہیں تو اس کا مائنڈ (mind) پہلے سے زیادہ ایکٹیو ہو جاتا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ کام کرنے لگتا ہے۔ پہلے اگر وہ انسان تھا تو اب وہ سپر انسان بن جاتا ہے۔ اس کو ہر آدمی اپنے تجربہ (experience) سے جانتا ہے کہ ہر گھر میں کوئی ہوتا ہے جو گھر کا کام سنبھالے ہوئے ہوتا ہے پھر وہ اچانک مر جاتا ہے۔ مگر اس ایکسیڈینٹ کے بعد گھر کا کام نہیں رکتا۔ وہ پہلے کی طرح چلتا رہتا ہے بلکہ کبھی کبھی پہلے سے زیادہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں صحیح فارمولا یہ ہے کہ کسی بھی عذر کو عذر نہ بنایا جائے۔

ہماری گاڑی کو جو ڈرائیور چلا رہے تھے، ان کا نام سردار منجیت سنگھ تھا۔ ان سے ہم نے بعض موضوعات پر بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ انھیں ہماری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنی ساری توجہ صرف گاڑی کو چلانے میں لگائے ہوئے تھے۔ وہ پورے معنوں میں ایک پروفیشنل ڈرائیور تھے۔ وہ ڈرائیور تھے اور صرف ڈرائیور۔

سردار منجیت سنگھ اپنی روایتی پگڑی کے ساتھ پوری طرح ایک سکھ دکھائی دیتے تھے لیکن گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مسائل سے ان کی دلچسپی اتنی کم ہے کہ ان کے پاس یہ سوچنے کا وقت بھی نہیں کہ آج سکھ برادری کا ایک آدمی (ڈاکٹر من موہن سنگھ) انڈیا کا پرائم منسٹر بنا دیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے لئے یہ ایک غیر متعلق (irrelevant) خبر ہے۔ ان کو اس سے

کوئی دلچسپی نہ تھی کہ اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے اور پالیٹکس کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ ورک کلچر کا پورا نمونہ تھے۔

۱۹ مئی ۲۰۰۴ کو نئی دہلی کے تمام اخباروں کی ہیڈ لائن صرف ایک تھی، اور وہ یہ کہ ڈاکٹر من موہن سنگھ کو انڈیا کا پرائم منسٹر مقرر کیا گیا۔ اس خبر کی سرخی روزنامہ ایشین اتیج نے ان الفاظ میں قائم کی تھی: راج کرے گا خالصہ۔ مگر سردار منجیت سنگھ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا مقصد صرف ایک تھا، اور وہ تھا، اپنی گاڑی کو دھیان کے ساتھ چلائیں۔

سکھ کمیونٹی انڈیا کی آبادی کا صرف دو فی صد حصہ ہے۔ مگر سکھ لوگ انڈیا کی اقتصادیات کے تقریباً بیس فی صد حصہ کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ وہ دنیا میں ہر جگہ اپنی مخصوص پگڑی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر ایرپورٹ اور دنیا کی ہر سڑک پر اپنے امتیازی نشان کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ سردار منجیت سنگھ کے تجربہ نے مجھے بتایا کہ سکھ لوگوں کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ وہ زندگی کا یہ سادہ فارمولا ہے — اپنے کام سے کام رکھو۔

۳ جون کی شام کو ہم دہلی واپس آ گئے۔ یہ سفر یا سفری کلاس بظاہر بہت مختصر تھا مگر وہ تجربوں اور نصیحتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس مختصر سفر میں بہت سے سبق سیکھنے کا موقع ملا۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ سفر کی کامیابی کو جانچنے کا معیار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ سفر شروع سے آخر تک سبق بن جائے۔ اور اس معیار کے اعتبار سے ۳ جون ۲۰۰۴ کا یہ یک روزہ سفر بلاشبہ ایک کامیاب سفر تھا۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط وکتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323

الرسالہ کی نئی مطبوعات

● سیرتِ رسول	صفحات	۱۷۲
● امنِ عالم	صفحات	۲۰۸
● عورت: معمارِ انسانیت	صفحات	۲۵۰

حیدر آباد میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں۔ ٹیلی فون پر آرڈر دے کر بھی کتابیں منگوائی جاسکتی ہیں:

حافظ عبدالغفار صاحب
مکان 16-8-663 (بی کلاس 168)
فتبال گراونڈ، جدید ملک پٹھ، حیدر آباد 500036
موبائل: 9440057526

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$20/£10	$10/£5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$35/£18	$18.£8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$50/£25	$25/£12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$80/£40	$40/£18

Goodword Books Pvt. Ltd.

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013

Tel. (9111) 2435 6666, 2435 5454, Fax (9111) 2435 7333, e-mail: info@goodwordbooks.com

ORDER FORM (URDU BOOKS)

QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES
	60.00	مضامین اسلام		12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)		400.00	تذکیر القرآن (مکمل، مجلد)
	10.00	باغ جنت		80.00	ڈائری (جلد اول)		250.00	تذکیر القرآن (پیپر بیک)
	10.00	نارجہنم		65.00	کتاب زندگی		85.00	اسباق تاریخ
	10.00	سچا راستہ		25.00	اقوال حکمت		60.00	تعمیر حیات
	10.00	دینی تعلیم		10.00	تعمیر کی طرف		50.00	تعمیر انسانیت
	10.00	خلیج ڈائری		20.00	تبلیغی تحریک		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار جلد اول
	10.00	رہنمائے حیات		25.00	تجدید دین		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد دوم
	10.00	تعدد ازواج		35.00	عقلیات اسلام		80.00	اسلام: ایک تعارف
	60.00	ہندستانی مسلمان		25.00	قرآن کا مطلوب انسان		60.00	اللہ اکبر
	10.00	روشن مستقبل		10.00	دین کیا ہے؟		50.00	پیغمبر انقلاب
	10.00	صوم رمضان		20.00	اسلام دین فطرت		65.00	مذہب اور جدید چیلنج
	8.00	اسلام کا تعارف		10.00	تعمیر ملت		35.00	عظمت قرآن
	20.00	علما اور دور جدید		10.00	تاریخ کا سبق		60.00	عظمت اسلام
	60.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین		8.00	فسادات کا مسئلہ		10.00	عظمت صحابہ
	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے		8.00	انسان اپنے آپ کو پہچان		80.00	دین کامل
	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ		8.00	تعارف اسلام		45.00	الاسلام
	10.00	یکساں سول کوڈ		8.00	اسلام پندرہویں صدی میں		50.00	ظہور اسلام
	10.00	اسلام کیا ہے؟		12.00	راہیں بند نہیں		40.00	اسلامی زندگی
	40.00	میوات کا سفر		10.00	ایمانی طاقت		35.00	احیاء اسلام
	35.00	قیادت نامہ		10.00	اتحاد ملت		65.00	راز حیات
	8.00	منزل کی طرف		20.00	سبق آموز واقعات		40.00	صراط مستقیم
	125.00	اسفار ہند		10.00	زلزلۂ قیامت		60.00	خاتون اسلام
	100.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹		12.00	حقیقت کی تلاش		50.00	سوشلزم اور اسلام
	70.00	قال اللہ وقال الرسول		8.00	پیغمبر اسلام		30.00	اسلام اور عصر حاضر
	90.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱		10.00	آخری سفر		40.00	الربانیہ
	80.00	مطالعۂ قرآن		10.00	اسلامی دعوت		45.00	کاروان ملت
	40.00	مذہب اور سائنس		20.00	حل یہاں ہے		30.00	حقیقت حج
	100.00	دین و شریعت		25.00	امہات المومنین		35.00	اسلامی تعلیمات
	60.00	مطالعۂ سیرت		85.00	تصویر ملت		25.00	اسلام دور جدید کا خالق
	10.00	خدا اور انسان		50.00	دعوت اسلام		40.00	حدیث رسول
	8.00	ہندستان آزادی کے بعد		40.00	دعوت حق		35.00	راہ عمل
	100.00	مسائل اجتہاد		80.00	نشری تقریریں		80.00	تعبیر کی غلطی
	120.00	مطالعۂ حدیث		60.00	دین انسانیت		25.00	دین کی سیاسی تعبیر
	100.00	امن عالم		50.00	فکر اسلامی		10.00	عظمت مومن
	100.00	عورت: معمار انسانیت		50.00	شتم رسول کا مسئلہ		8.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد
				8.00	طلاق اسلام میں		8.00	تاریخ دعوت حق
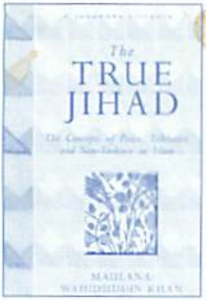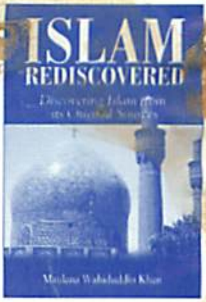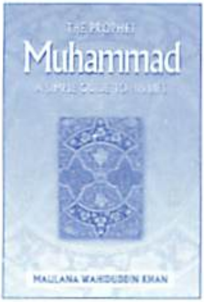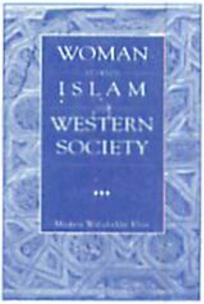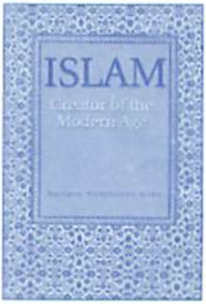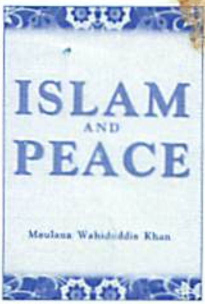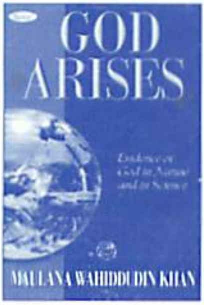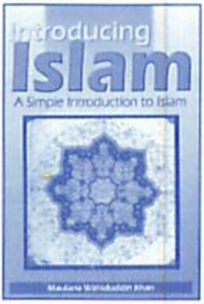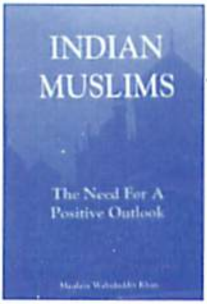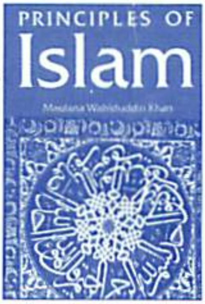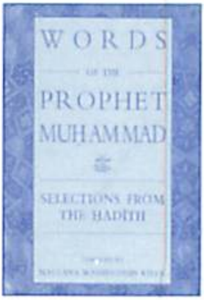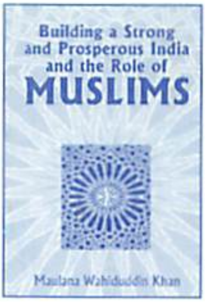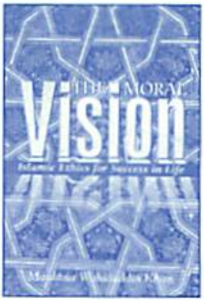
RNI 28822/76 • U(SE) 12/2003-05
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2003-05